قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا ستترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اپریل 2020ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

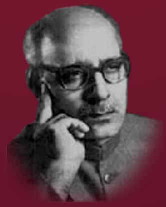

لَوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

(علامہ اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اپریل 2020ء

جلد 73 شمارہ نمبر 04

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: بیادِ اقبالؒ	ادارہ	4
عورت (مارچ) قرآن کے آئینے میں	ادارہ	9
عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے علامہ پرویزؒ کی علمی خدمات	ڈاکٹر شاکر حسین خان، کراچی	34
اسلامی نظام اتنے مختصر عرصہ میں کیوں ختم ہو گیا	خواجہ ازہر عباس، کراچی	46

ENGLISH SECTION

SPREAD OF CORONAVIRUS (COVID-19) AND THE QURAN Dr. Ejaz Rasool, Glasgow, UK	57

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بیادِ اقبالؒ

تاریخ انسانیت میں دو انقلاب بڑے عظیم ہیں۔ پہلا انقلاب' انسانی راہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت تھی۔ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے انسان کو عقل وفکر کی صلاحیت سے نوازا گیا تھا' لیکن زندگی کے ابدی حقائق کا دریافت کرلینا اس کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے آئینِ فطرت میں استثناء کیا گیا اور ان حقائق کا انکشاف وحی کے ذریعے کیا گیا۔ وحی' حاملِ وحی کی فکری تخلیق نہیں تھی۔ اسے یہ علم' خدا کی طرف سے براہ راست عطا ہوتا تھا۔ پھر' نبی کا منصب اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے یہ علم پاتا تھا یا اس علم کو دوسروں تک پہنچا دیتا تھا اور بس۔ وہ اس علم کی روشنی میں انسانوں کی راہنمائی کرتا تھا' ان کے معاملات کو سلجھاتا تھا۔ انہیں مل جل کر رہنے سہنے کے طور طریق سکھاتا تھا۔ راہنمائی کا یہ طریق' انسانی دنیا میں پہلا انقلابِ عظیم تھا۔

اور دوسرا انقلاب ختم نبوت تھا۔ انسانی زندگی کے لئے جس قدر اصولی ہدایات کی ضرورت تھی اسے مکمل اور غیر متبدل شکل میں عطا کر دیا گیا اور اس ضابطۂ ہدایت کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اپنے اوپر لے لیا۔ انسانوں کو خدا کی طرف سے براہ راست جو علم ملنا تھا' وہ آخری مرتبہ مل گیا۔ اس کے بعد' اس ذریعۂ علم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔۔ باقی رہا نبی کا دوسرا فریضہ۔ یعنی آسمانی ہدایت کی روشنی میں انسانوں کی حیات اجتماعیہ کی تشکیل اور ان کے معاملاتِ زندگی کا حل۔ سو یہ فریضہ اس امت کے سپرد کر دیا گیا جسے قرآن نے ''خیر امت'' کہہ کر پکارا' اور اسے ''وارثِ کتاب'' قرار دیا۔ یعنی اب اصولی طور پر انسانی راہنمائی کے لئے' خدا کی مکمل' غیر متبدل' محفوظ کتاب (قرآن کریم) اور اس کی روشنی میں عقل وفکر اور علم وبصیرت کو کافی قرار دے دیا گیا اور زندگی کے عملی نظام کی ذمہ داری اس امت کے سپرد کر دی گئی جسے کہہ دیا گیا کہ اپنے معاملاتِ حیات (اس کتاب عظیم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے) باہمی مشورہ سے طے کرلیا کرو۔ بالفاظِ دیگر' ختم نبوت کا عملی مفہوم یہ تھا کہ اب انسان' انفرادی اتھارٹی سے بے نیاز ہو گیا اور اشخاص کے بجائے امتوں کا زمانہ آ گیا۔ تاریخ انسانیت میں یہ انقلاب بھی بڑا عظیم انقلاب تھا۔ اس سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات ارضی کے بعد' امت نے اس نظام کو قائم رکھا جس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں

سے رکھی گئی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جب تک وہ نظام قائم رہا' امت کے پاس ایک ہی کتاب تھی (یعنی قرآن کریم)۔ کوئی اور کتاب نہیں تھی جس کی طرف راہنمائی کے لئے رجوع کیا جائے۔ اس کا ایک ہی نظام تھا جس کے فیصلے ہر ایک کے لئے واجب التسلیم تھے اور امت' امت واحدہ تھی۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں تھا' کوئی پارٹی نہیں تھی۔ اس کے بعد جب اس نظام کا شیرازہ بکھر گیا تو امت کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ اب ایک اتھارٹی کی جگہ متعدد اتھارٹیز وجود میں آ گئیں۔ ایک کتاب کی جگہ متعدد کتابوں نے لے لی اور امت کے بجائے متعدد فرقے ظہور میں آ گئے۔ رفتہ رفتہ' خدا کی کتاب عظیم' محض تلاوت بغرض حصول ثواب باقی رہ گئی اور اسلام' دین (نظام حیات) کے بجائے مذہب بن گیا۔۔ انفرادیت' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' رہبانیت' قارونیت' سب اسی شجرۃ الزقوم کے برگ وبار ہیں۔ اگر آسمانی سلسلۂ رشد وہدایت کے پروگرام کا آغاز اور اس کا اختتام' انسانی تاریخ کے عظیم انقلابات تھے' تو اسلام میں یہ تغیر بھی کچھ کم تحیر انگیز نہیں تھا۔ اس تغیر سے امت مسلمہ اسی مقام پر پہنچ گئی جس مقام پر' بعثت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت' سابقہ اہل کتاب پہنچ چکے تھے۔ سابقہ اہل کتاب کو اس حالت سے نکالنے کے لئے' نبی آ جاتا تھا لیکن اس امت کے لئے یہ صورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ باب نبوت بند ہو چکا تھا لیکن سابقہ امتوں اور اس امت میں فرق یہ تھا کہ اس امت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود تھی اس لئے اسے کسی نبی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ یہ خدا کی اس کتاب کو وہی مقام دے دیں جو اس کا حقیقی مقام تھا۔ یعنی معاملاتِ حیات میں اسے آخری سند وحجت قرار دے دیں اور اس کے مطابق' اپنا نظامِ زندگی متشکل کرلیں۔ یہ اس امت کے اپنے کرنے کا کام تھا۔ اس کے لئے اسے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

اقبالؔ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے امت کی توجہ اس فراموش کردہ حقیقت کی طرف مبذول کرائی اور اسے قرآن کے صحیح مقام سے آشنا کرایا۔ آپ ان کے کلام کا اس زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ شروع سے اخیر تک اس پیغام کو دہرائے چلے جاتے ہیں۔ یعنی' قرآن' نظام' مرکزیت' اجتماعیت' وحدتِ امت' حتیٰ کہ وحدتِ انسانیت۔۔ ان کے کلام کا آغاز مثنوی اسرار ورموز سے ہوتا ہے۔ وہ اس میں درخشندہ الفاظ میں لکھتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست
آں کتابِ زندہ' قرآنِ حکیم — حکمتِ اُولا یزال است و قدیم

اور اس کے بعد اس کتابِ عظیم کی عظمت ورفعت اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ انسان کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ اقبالؔ شناس حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ فکرِ اقبالؔ کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس سوال کا جواب اقبالؔ نے خود (اس مثنوی کے آخر میں) اس دعا کی تشکیل میں دے دیا تھا جس سے زیادہ اثر انگیز دعا شاید ہی کوئی اور ہو۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

تو۔۔ گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحر فم غیر قرآں مضمر است
اور۔۔ روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
اور۔۔ گر ور اسرار قرآں سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
تو۔۔ درعمل پائندہ تر گرداں مرا آب نیسا نم گہر گرداں مرا

اور اس حسین آغاز کے بعد، وہ تمام عمر، امت کی توجہ اسی کتابِ عظیم کی طرف مبذول کراتے رہے۔ فکرِ اقبالؒ کے کئی گوشے ایسے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ان کے پیش کردہ نکات میں تضاد بھی پایا جاتا ہے کہ ان کی فکر بالآخر ایک انسان کی فکر تھی جس میں سہو و خطا بھی ہوتا ہے اور بالیدگی و ارتقاء بھی۔ لیکن جو کچھ انہوں نے قرآن کے متعلق کہا ہے اس میں نہ گنجائشِ اختلاف ہے نہ شائبہ تضاد۔ ایک ہی پیغام ہے جسے وہ مختلف انداز سے دہراتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس انداز سے کہ

چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

کہیں ان الفاظ میں کہ:

جُز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اور۔۔۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

کہیں قرآن اور تلوار کے متعلق کہتے ہیں کہ:

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

اور کہیں اس میں ایک تیسری چیز کا اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

مرد مومن را عزیز اے نکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

اور بالآخر اس تمام تفصیل کو اس ایجاز میں سمیٹ دیتے ہیں کہ

گر تومی خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

انہوں نے اپنے اشعار ہی میں اس حقیقت کو واشگاف نہیں کیا بلکہ جہاں اور جب بھی انہیں موقعہ ملا، قرآن کی اہمیت کو بہر رنگ نمایاں کرتے چلے گئے۔ اپنے بیانات میں، خطبات میں، تقاریر میں، پیغامات میں، حتیٰ کہ دوستوں اور

ہمنواؤں کے نام اپنے خطوط میں، ہر تقریب اور ہر مقام پر اس پیغام کو دہراتے رہے۔ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

قرآن کامل کتاب ہے، اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

(مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اپنے مشہور ''معرکۂ دین و وطن'' میں ان سے کہتے ہیں کہ:

جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔

وہ اپنے ایک مقالہ میں قرآن کے پیش نظر مقصد کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسلم بہ حیثیت فرد وہ انسان بن سکے جسے وحیٔ خداوندی احسن التقویم کے نام سے تعبیر کرتی ہے، اور ملت اسلامیہ وہ ملت بن جائے جو قرآن پاک کے الفاظ میں دنیا کی بہترین امت (خیر الامم) ہو۔

قرآن کو فراموش کر دینے کا لازمی نتیجہ تقلید اور جمود تھا اس لئے کہ قرآن تو زندگی کی ہر آن حرکت کو سامنے لاتا ہے اور دین کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ انسان کو اس قابل بنا دے کہ وہ عمل پیہم اور سعیٔ متواتر سے زندگی کی ارتقائی منازل طے کر سکے۔ لہٰذا، جمود و تعطل اس کے نزدیک موت کے مرادف ہے۔ اسی جمود کا نتیجہ ہے کہ وہ فقہی قوانین جو آج سے صدیوں پہلے، اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق انسانی کوششوں سے وضع ہوئے تھے، انہیں وحیٔ خداوندی کی طرح ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ اپنے خطبات تشکیلِ جدید میں لکھتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند چونکہ غیر معمولی طور پر قدامت پسند واقع ہوئے ہیں لہٰذا ہندوستانی عدالتیں مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سرِ مو انحراف نہ کریں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں مگر قانون جہاں تھا وہیں کھڑا ہے۔

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

بدقسمتی سے قدامت پسند مسلمان عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتے ہیں اور ذرا ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

ان کے نزدیک' کرنے کا کام یہ تھا کہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں ایسے قوانین مرتب کئے جائیں جو ہمارے موجودہ تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

اقبالؒ نے یہ کچھ اس زمانے میں لکھا تھا جب یہاں انگریزوں کی حکمرانی تھی اور اپنے لئے آپ قوانین مرتب کرنے کے ہمیں اختیارات حاصل نہیں تھے۔ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا تصور ہی اس لئے پیش کیا تھا کہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں اپنے لئے ضابطۂ قوانین خود مرتب کرلیں اور اسی کے مطابق ہماری مملکت کا کاروبار سرانجام پائے۔ ظاہر ہے کہ تشکیل پاکستان کے وقت علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو وہ سب سے پہلے یہی کام کرتے یا کراتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ اس سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے اور اس مملکت کے ساتھ وہی کچھ ہوا جس کا انہیں خدشہ تھا کہ

زاغوں کے تصرف میں ہیں شاہیں کے نشیمن

چنانچہ یہاں ہوا یہ کہ جمود و تعطل کی گرہیں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوگئیں اور وہ حقیقی اسلام، جس کے متعلق انہوں نے (فوقؔ مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں) لکھا تھا کہ ''وہ ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے''، جنس فراموش تر ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ کہنا کہ ہمارے نظام وقوانین کی اساس قرآن خالص پر ہونی چاہئے' جرمِ عظیم قرار پا گیا۔ اقبالؒ نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے' یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بگڑ کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

آج یہ خطرہ اس وقت سے بھی زیادہ مہیب اور قریب تر نظر آ رہا ہے۔ اس لئے بھی کہ علامہ اقبالؒ نے' اپنی زندگی کے آخری ایام میں' مدیر احسانؔ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

وہ شخص جو دین کو سیاسی پراپیگنڈے کا پردا بناتا ہے' میرے نزدیک لعنتی ہے۔

(انوار اقبالؒ مرتبہ بشیر احمد ڈار، ص:168)

اور پاکستان میں آج یہ کھیل کھلے بندوں کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ قرآن' جہاں زمان و مکان کی حدود سے مستغنی ہے وہاں وہ کسی خاص ملک اور قوم سے بھی وابستہ نہیں۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ (47:38)

☆☆☆☆☆☆☆☆

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عورت (مارچ)
قرآن کے آئینے میں

ہم نے اس موضوع پر اکثر و بیشتر لکھا ہے۔ اور بکثرت لکھا ہے۔ علاوہ ان مقالات کے جو وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں، پرویز صاحب کی مستقل تصنیف ''طاہرہ کے نام'' اس موضوع پر بڑی معلومات افزا ہے۔ نیز مطالب الفرقان کی مختلف جلدوں میں متعلقہ آیات کی تشریحات مزید تفصیلات درآغوش ہیں۔ اس لئے ہمیں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن حال ہی میں اس موضوع نے ملک میں جو اہمیت حاصل کی تو اس سے متاثر ہو کر، بیشتر قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے کہ طلوع اسلام میں اس موضوع پر ایک جامع مقالہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا جائے۔ ازرہِ امتثال امر مقالہ پیش خدمت ہے جو (ظاہر ہے کہ) بنیادی طور پر پرویز صاحب کی تصانیف اور طلوع اسلام میں شائع شدہ مقالات پر مبنی ہے۔ چونکہ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر پیش کیا جاتا ہے وہ بیشتر یہودیت اور عیسائیت میں رائج ''افسانوں'' پر مشتمل ہے اس لئے بغرض تقابل بعض مقامات پر ان کے لٹریچر کے اقتباسات یا حوالے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ ان سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ جو کچھ ہمارے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے، اور اس کے بعد جب قرآنی حقائق کو سامنے لایا جائے گا، اس سے واضح ہو جائے گا کہ دین کی رو سے حقیقت کیا ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے پیش نظر نہ کسی سے بحث و مباحثہ ہے۔ نہ کسی پر تنقید و تنقیص مقصود۔ ہمارا مقصد صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے۔ اس سے اگر کسی مروجہ عقیدہ یا کسی کے کسی دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس باب میں مدعی، قرآن ہے۔ ہم نہیں۔ ہمارا فریضہ قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس۔

عیسائیت میں عورت کا مقام:

بائبل میں کہا گیا ہے کہ آدم اور اس کی بیوی جنت میں تھے۔ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آکر بہک اور بھٹک گیا۔ اس بنا پر عیسائیت گناہ اول کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت، دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے، اس لئے انتہائی قابل نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر، عورت کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو

ملعون ومردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد وکی زندگی کو وجہ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی ''جنسی آلائش'' سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں' صدیوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ ''جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ' میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں''۔ اس کے بعد اس نے کہا:۔

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا' عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا' عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہئے انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ پر رہنا چاہئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے۔
>
> (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ ''عورت' شیطان کا دروازہ' برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے''۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جاسکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی۔ مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر وتانیث کا امتیاز ہی اٹھ جائے گا۔ (1)

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شیطان نے آدم کی بیوی (عورت) کو نہیں بہکایا تھا بلکہ آدم اور اس کی بیوی (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا تھا۔ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ (2:36) ''شیطان نے مرد اور عورت' دونوں کو (هما) بہکایا''۔ (قصہ آدم کی قرآنی تصریحات پرویز صاحب کی کتاب ''ابلیس وآدم'' یا ''مطالب الفرقان'' جلد دوم میں ملیں گی)۔

عورت کی پیدائش:

عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور' خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائش آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

---

(1) ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب: "WOMAN IN ANTIQUITY BY CHARLES SALTMAN"

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے ان سے انس ومحبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔

(ترجمہ اردو، مولانا محمد جونا گڑھی، پارہ اوّل ص:85)

دوسری جگہ ہے کہ:

صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (ایضاً پارہ چہارم ص 66)

اس تفسیر اور روایات کی رو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں' حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا) ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے' اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس ''ٹیڑھی پسلی'' کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور ﷺ کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پا گئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورۃ النساء میں ایک آیت ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ''مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں'' (اس کا صحیح مفہوم آگے چل کر بیان کیا جائے گا) اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (سورۃ النساء، پارہ پنجم) میں ہے کہ

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری' اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک

انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یارسولؐ اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا، جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔آپؐ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔

(صفحہ 20) اردنا امرا و اراد اللہ وغیرہ، تفسیر المنار، مفتی عبدہ، جلد:5، صفحہ:74

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔یعنی (اس روایت کی رو سے) حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں۔(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔(ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضوؐر کا ہر قول، وحی خداوندی پر مبنی ہوتا تھا۔وہ ذرا سوچیں کہ اس عقیدہ کی رو سے اس ارشاد نبویؐ کا کیا مفہوم ہوگا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا)۔اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں (بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔کیا انہیں کو لونڈیاں کہہ کر پکارا گیا ہے) کو مارو نہیں۔اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمرؓ فاروق آئے اور عرض کرنے لگے یارسولؐ اللہ! عورتیں آپؐ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔

حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ کا مہمان ہوا۔اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی۔اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔پھر مجھ سے فرمانے لگے۔اشعثؓ تین باتیں یاد رکھ جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔(صفحہ:21-20)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں۔

(صفحہ 21)

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتب روایات بھری پڑی ہیں مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ اللہ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری، کتاب پیدائش انبیاؑ)

دوسری روایت ہے:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعث مضرت نہیں۔

(بخاری، کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ:

حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا۔

(بخاری، کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ:

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔(1) (بخاری، کتاب الانبیاءؑ)

یہ روایات وضعی ہیں:

صاف نظر آ رہا ہے کہ اس مقصد کے پیش نظر، کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کر سکیں کہ بائبل میں یا عیسائیت کے عقائد کی رو سے عورت کو کس قدر قابل نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے تحت اس قسم کی روایات، وضع کیں اور انہیں ہماری کتب احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا ہی کیا تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان وضعی روایات کو احادیث رسول اللہ ﷺ قرار دے کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی، حضور رسالت مآب ﷺ کی طرف نسبت کس طرح صحیح قرار پا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو ''سوختہ بخت'' یہ کہہ دے کہ ایسی روایات کی نسبت حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اسے ''منکر حدیث'' قرار دے کر دائرہ

---

(1) ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جنت، ماں کے قدموں کے نیچے ہے'' اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں ''مائیں'' نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں۔ اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی۔ تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ''بیوی'' ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور حیثیت نہیں ہوتی۔

اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عورتوں کو مارنے پیٹنے کی تائید میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس آیت کا قرآنی مفہوم سامنے لایا جائے۔ یہ پوری آیت اور اس کا مروجہ ترجمہ یوں ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝٣٤
(4:34)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے، پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑ دو ان کو بیچ خوابگاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔

(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

اب اس آیت کے قرآنی مفہوم کی طرف آیئے:

آیت کا صحیح مفہوم:

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ۔ (عام مردوں) اور النِّسَآءِ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے، اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے طبیعی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکثر اوقات اکتساب رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہیں۔ لغت میں قام الرجل علی المراۃ کے معنی دیئے ہیں۔ مانھا یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوام علیھا کے معنی ہیں مائن لھا یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے لئے اکتساب

رزق کریں۔ اس لئے کہ ''بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ''تقسیم کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتساب رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے اکثر اوقات معذور ہوجاتی ہیں' اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق' عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ ''وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِھِمۡ ؕ'' اس سے عورتوں کی ضروریات زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی...... ''فَالصّٰلِحٰتُ'' اور انہیں فراغت نصیب ہوجائے گی کہ وہ اپنی خاص صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنِتٰتٌ کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد' اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتساب رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ: حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کرسکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے۔ (یعنی جنین کی حفاظت)۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن' عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویوں ''فَالصّٰلِحٰتُ'' کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرماں بردار ''قٰنِتٰتٌ'' ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری اور عصمت کی حفاظت کریں۔ گویا صٰلِحٰتُ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورہ احزاب (33:35) میں یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر احکام الہیہ کا ''فرماں بردار'' ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا' یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں' اور عورتیں' مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے' اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانون خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔ خود لفظ (زوج) میں مکمل موافقت اور کامل رفاقت کا مفہوم پنہاں ہے۔

عورتوں کو مارنا:

اب آگے بڑھئے۔ آیت کا باقی ماندہ حصہ یہ ہے۔ ''وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ فَعِظُوۡھُنَّ وَاھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡھُنَّ ۚ'' چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام

مرد کی فرمانبرداری ہے' اس لئے باقی ماندہ آیت کا مفہوم' اسی کی تائید میں' یہ لیا گیا کہ اگر بیوی' مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے' پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کرلے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اسے مارے پیٹے۔

لیکن' جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے' یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہورہی' عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہورہی ہے۔ یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں اور عورتیں' رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہوجانے کے بعد اپنے خصوصی وظائف حیات کو بطریق احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رو سے وہ اکتساب رزق کی طرف سے مطمئن ہوجاتی ہیں) معاشرے کے اس نظم اور تقسیم کار کے اصول سے بلاعذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آج کل یورپ کے بعض ممالک میں ہورہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں' بلاعذر' اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہوجائے گا اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظربندی (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISHMENT) بھی دی جاسکتی ہے۔ واضح رہے کہ عورت کو نسل کشی کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مقصد اس ارشاد خداوندی کا یہ ہے کہ نسل کشی کے خلاف سرکشی کی تحریک نہ پیدا ہونے دی جائے۔

یہاں ضمناً یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اسلامی نظام کے لئے مملکت کا وجود لاینفک قرار دیا ہے۔ لیکن اس نے مملکت' حکومت' نظام عدل اور اس کی جزئیات' عدالت وغیرہ اصطلاحات استعمال نہیں کیں۔ چونکہ وہ نظام مملکت کی ذمہ داری تمام امت کے سر پر ڈالتا ہے اس لئے وہ تمام امور کی سرانجام دہی کے لئے (جو آج کل حکومت کے مختلف شعبوں کی طرف سے سرانجام دیئے جاتے ہیں) صرف کم (تم) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یا (ہم) کا لفظ۔ مثلاً وہ سرقہ کی سزا کے لئے کہتا ہے کہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (5:38) تم سارق مرد اور سارقہ عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو'۔ ظاہر ہے کہ سرقہ کے ملزموں کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا۔ جرم ثابت ہونے پر سزا کا فیصلہ بھی عدالت کی طرف سے ہوگا' اور اس سزا پر عمل درآمد حکومت کی انتظامیہ کی طرف سے' لیکن قرآن کریم نے نہ عدالت کا ذکر کیا ہے' نہ انتظامیہ کا۔ صرف ''تم'' کہا ہے۔ ''تم'' سے مراد یہ نہیں کہ معاشرہ میں ہر ایک (یا مستغیث) کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ خود ہی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس سے واضح ہے کہ آیہ زیرنظر (4:34) میں مردوں (خاوندوں) کو اس کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیویوں کو پیٹنا شروع کر دیں۔ ایسا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہوگا۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند اپنی بیویوں پر حاکم اور داروغے ہیں اور انہیں

حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم اور مغلوب رکھیں۔ قرآن تو کسی انسان کو بھی اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔

مرد اور عورت ہمدوش

قرآن کریم نے انسان ہونے کی جہت سے کس طرح مردوں اور عورتوں کو یکساں مقام پر رکھا ہے' اس کے متعلق اصولی طور پر گفتگو مقالہ کے اخیر میں کی جائے گی۔ اس مقام پر چند ایک آیات درج کی جاتی ہیں' جن سے واضح ہوگا کہ قرآن کریم کس طرح' مصافِ زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں' مردوں اور عورتوں کو ہم دوش اور ہم قدم قرار دیتا ہے۔ مثلاً اس نے سورہ احزاب میں کہا ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۳۵﴾ (33:35)

اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانون خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے ''الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ'' اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امن عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں۔ ''وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ'' اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانون خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے ''وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ'' اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں' تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں ''وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ'' اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں ''وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ'' اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں' وہ شاخ ثمر دار کی طرح قانون خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں' تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے ''وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ'' اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے ''وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ'' اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ ''وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ'' اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں ''وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ'' اگر مرد قانون خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے ''وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ'' اب یہ صلاحیتیں' دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ لہٰذا نظام خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا

سامان اوراجر عظیم موجود ہے۔"اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا"

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کرسکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کی جنت میں وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَھُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا ﴿۱۲۴﴾ (4:124) ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں ہوگا۔ لَآ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ (3:195) اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات اور ایثار وقربانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ جنین، ماں کے خون سے مترتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہار اور برداشت کا مادہ اس قدر فراواں ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضہ کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے پورا کئے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صلہ یا معاوضہ کی متمنی نہیں ہوتی۔ یہ اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں جن میں عورت منفرد ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے امت مسلمہ (مملکت اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے:

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۘ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیۡعُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ سَیَرۡحَمُھُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۷۱﴾ (9:71)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظام صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں یعنی یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایہ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت وحکمت کی رو سے ہوگا۔

آپ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہوسکتی ہے۔

واضح رہے کہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" وعظ ونصیحت کا نام نہیں۔ یہ حکومت کا فریضہ ہے۔ سورۃ الحج میں ہے کہ:

اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ‏ ﴿۴۱﴾ (22:41)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت حاصل ہوگی تو یہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے اور تمام امور کا آخری فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ جب آیت (9:71) میں' مردوں اور عورتوں' دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے' تو ظاہر ہے کہ عورتیں بھی امور مملکت میں برابر کی شریک ہوسکتی ہیں۔

حقوق وفرائض:

جہاں تک مردوں (خاوندوں) اور عورتوں (بیویوں) کے حقوق وفرائض کا تعلق ہے' قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو چار الفاظ میں اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ (2:228)

جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں۔

یعنی جو ذمہ داری بھی ان پر عائد کی جائے' اس کے مقابل میں ان کا ایک حق ثابت ہو جاتا ہے۔۔۔ ہر ذمہ داری کے بالمقابل ایک حق۔۔۔ فرمایئے! اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہوسکتی ہے؟

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ وہی آیت جس کی رو سے قرآن کریم نے عورت اور مرد کے حقوق اور فرائض کو یکساں قرار دیا ہے' یہ حضرات اسے اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ مردوں کے مدارج عورتوں کے مقابلہ میں بلند ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی دلچسپ بھی ہے اور حسرت آمیز بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ کے بعد ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ‌ؕ (2:228) جس کے (ان کے نزدیک) معنی ہیں۔ ''مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔'' یا یہ کہ مردوں کے درجات عورتوں کی بہ نسبت بلند ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق اور فرائض ایک جیسے ہیں لیکن مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے تو یہ کھلا ہوا تضاد ہوگا۔ اگر ان کے حقوق وفرائض مساوی ہیں تو پھر ایک جنس کو دوسری پر فضیلت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟ اور ایک کے درجات بلند کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم نے درجۃ کہا ہے جس کے معنی ایک درجہ کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایک درجہ کیا ہے جو عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو حاصل ہے۔ اس کا جواب پوری آیت سامنے لانے سے مل جاتا ہے۔ آیت یوں ہے:

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡٓ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ‌ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ

الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؁ (2:228)

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاح ثانی کے لئے) تین حیض کے عرصہ تک روکے رکھیں (جسے عدت کی مدت کہتے ہیں)......(اس کے بعد عدت کی تفصیلات دی گئی ہیں اور پھر کہا گیا ہے کہ) یہ ایک بات ہے جس میں عورت کے مقابلہ میں مرد کو پوزیشن ایک گونہ (Advantageous) ہے۔ یعنی عورت کے لئے عدت ہے۔ مرد کے لئے عدت نہیں۔ ورنہ، قانون خداوندی کی رو سے مرد اور عورت کے حقوق اور فرائض یکساں ہیں۔

یہ ہے وہ آیت جس کی رو سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر افضلیت حاصل ہے۔

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی:

1- وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا ہے اور

2- شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

وراثت میں لڑکی کا حصہ:

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو 4:11) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتساب رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت کو بالعموم اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتساب رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتساب معاش کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتساب رزق کرنا ہوتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (1/6) یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (6/1)۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید نے کلیہ کے طور پر عورت کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کسمپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

(آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ مروجہ قانون شریعت کی رو سے، وصیت کا قرآنی قانون منسوخ سمجھا جاتا ہے! یاللعجب)۔

عورتوں کی گواہی:

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورۃ بقرہ میں آیت نمبر 282 میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبط تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے: فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے کہ:

اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ ''ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔''

ضلال کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ واضح تر الفاظ میں (To Get Confused or Become Perplexed) اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آیئے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ:

1- ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

2- یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے؟ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابل اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابل اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ قرآن مردوں کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابل اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابل اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار

کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (Comparative) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابل قبول قرار دیا ہے جیسا کہ ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو(24:9-6)۔

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

وہ تو زمانہ نزول قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گردوپیش اجنبی مرد ہوں۔ وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان پہچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا ساتھ ہونا اس کے لئے باعث تقویت ہوگا۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ:

أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (43:18)

یہ زیورات میں پلی ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا ہے کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے تو ان کے ساتھ (ان کی جان پہچان والی) ایک عورت کھڑی کر دو تا کہ اس کا حوصلہ بندھ جائے۔

ان تصریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ایک عورت کی شہادت کے بعد دوسری عورت کی شہادت لی جائے اور اس طرح دو شہادات ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کہیں (Confused) ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی سہیلی اسے یاد دلا دے کہ صحیح بات کیا تھی۔ (وہ عدالت سے کچھ نہیں کہے گی۔ گواہی دینے والی اپنی بہن کو صحیح بات یاد دلا دے گی) اس سے ظاہر ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کو کوئی گھبراہٹ نہ ہو وہ کہیں غلطی نہ کرے، تو ساتھ والی عورت کو مداخلت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ لڑکیوں کی پرورش ''زیورات'' میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملات زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور یوں غیر مبین (گونگی) بن کر رہ جائیں بلکہ انہیں زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے۔ اس صورت میں وہ غیر مبین نہیں رہیں گی اور دوسری عورت کی مداخلت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ ہے حقیقت ان اعتراضات کی جن کی رو سے عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل، ناقابل اعتماد اور مردوں سے پست درجہ پر قرار دیا جاتا ہے۔

عورتوں کے حقوق ملکیت:

پہلے کہا جا چکا ہے کہ تقسیم کار کی رو سے، بیوی بچوں کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت نہ کمائی کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں۔ وہ کمائی بھی کر سکتی ہے اور اسے ذاتی حقوق ملکیت بھی حاصل ہوتے ہیں۔ سورۃ النساء میں ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ (4:32)

ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوق ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے، عورت اپنے مال اور جائیداد کی آپ مالک ہوتی ہے (4:7) اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ مرد اور عورتیں، سب اکتساب رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ (یہ الگ بات ہے کہ گھر کی زندگی میں میاں بیوی باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں)۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے، بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اپنے آپ کو اپاہج بنا کر، مردوں کی کمائی کو تکتی رہیں اور خود کچھ نہ کریں۔ انہیں چاہئے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ عورت کو جو کچھ ترکہ میں ملے، وہ اس کی ملکیت ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کمائی کی بھی آپ مالک ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ گھر کا ماحول خوشگوار اور ازدواجی زندگی کامیاب ہو تو میاں بیوی کے تعلقات ''کاروباری'' نہیں رہتے۔ باہمی رفاقت اور تعاون کے ہو جاتے ہیں لیکن ملکیت کی قانونی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جس میں قرآن نے عورتوں کو مردوں سے (یا بیوی کو مرد سے) پست درجہ پر رکھا ہو! ہمارے ہاں عورت کے متعلق جو خیالات رائج ہیں (اور جنہیں بدقسمتی سے قوانین شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے) وہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے مستعار لے گئے ہیں۔ قرآن کا دامن ان سے پاک اور صاف ہے لیکن ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کا، عورت سے ضد، نفرت، تعصب کا یہ عالم ہے کہ زندگی میں تو ایک طرف، اس بے چاری کی موت کے بعد بھی یہ نفرت قائم رہتی ہے۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کا قتل کر دیا جائے تو اس کا خون بہا مرد کے خون بہا سے نصف ہوگا۔ عورت کی جان کی قیمت بھی مرد کی جان کی قیمت سے نصف ہے۔ جن کے تعصب کا یہ عالم ہو، ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عورت اور مرد کو ہم دوش تسلیم کر لیں گے، عبث ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ مملکت کا قانون، قرآنی ہو۔

پردہ:

اب ہم زیر نظر موضوع کے اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور چونکہ اس کا تعلق

جذبات سے ہے اس لئے وہ نازک بھی بہت ہے۔ ہمارے ارباب شریعت کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھر کی چاردیواری کے اندر بند رہنا چاہئے۔ اور اگر انہیں (مصیبت کے مارے کہیں) گھر سے نکلنا پڑے تو وہ چلتا پھرتا خیمہ (WALKING TENT) نظر آئے۔ عورتوں کو اس ہیئت میں رکھنے کے لئے انہیں کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا کہ انہوں نے ''اپنے احبار و رہبان (علماء ومشائخ) کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے''۔ یہی صورت ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہے۔ ان کا ہر ارشاد فرمان خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ سے بھی کہہ دیا تھا کہ: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (66:1)۔ جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے حرام مت ٹھہراؤ''۔ لیکن احبار و رہبان کو اس کا لائسنس حاصل ہے کہ وہ خدا کے جس حلال کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ جس حرام کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں۔ اس بات میں عورت بچاری ان کا سب سے پہلا اور بڑا ہدف ہے۔ اور اس کی ہر (خداداد) آزادی کو پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑ دینا' ان کا قابل فخر کارنامہ۔ پردہ اس کی شدید ترین شکل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حصہ لینے کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ان حضرات نے ان پر زندگی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔

پردہ سے متعلق قرآنی تعلیم کے سمجھنے سے پہلے' یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی اولین مخاطب قوم کی تمدنی اور معاشرتی سطح کیا تھی؟ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انہیں یہ بھی سمجھانا پڑتا تھا کہ چیخ چیخ کر بولنا اچھی عادت نہیں (31:19)۔ اکڑ کر چلنا معیوب ہے (31:18)۔ مجلس میں کھل کر بیٹھنا چاہئے اور جب مجلس برخاست ہو تو اٹھ کر چلے جانا چاہئے (58:11)۔ دوسروں کے ہاں جانا ہو تو اجازت لے کر جاؤ (24:27)۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز لینی ہو تو دروازہ سے باہر آواز دے کر مانگنی چاہئے (33:53) جب رسول اللہ ﷺ تمہیں کھانے کے لئے دعوت دیں تو ایسا نہ کرو کہ ابھی ہانڈیاں چولہے پر دھری ہوں اور تم کھانے کے لئے جا بیٹھو۔ نہ ہی ایسا کرو کہ کھانے کے بعد وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگ جاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے صاحب خانہ کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے (33:53)۔ اس قوم کو اس قسم کے عام آداب معاشرت بھی وحی کے ذریعے سمجھانے اور سکھانے پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تمدنی سطح (بالعموم) کیا تھی اور انہیں مہذب سوسائٹی کی سطح پر لانے کے لئے کس قدر تدریجی تعلیم وتربیت کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے ساتھ اختلاط وارتباط کا سوال اس میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ جہالت کا علاج تو مناسب تعلیم وتربیت سے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن (مدینہ میں) منافقین کی بھی خاصی تعداد تھی جن کا شیوہ ہی شرانگیزی تھا۔ عورتوں کے معاملہ میں شرانگیزی جس قدر آسان ہوتی ہے اسی قدر مہلک بھی۔ سورہ احزاب میں' اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (ﷺ) سے فرمایا کہ ''اپنی بیویوں'' بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے کپڑوں کے اوپر جلباب (OVER-ALL) پہن لیا کریں''۔ اس حکم کی ضرورت کیوں پیش آئی' اس کی وضاحت بھی وہیں کر دی۔ یہ مستورات باہر نکلتیں تو منافقین ان سے چھیڑ خانی کرتے۔ جب ان سے کہا

جاتا تو وہ جواب میں کہتے کہ ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا بازاری عورتیں۔ ان کی اس حجت کو پورا کرنے کے لئے مومن مستورات سے کہا گیا کہ تم جلباب پہن کر باہر نکلا کرو۔ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَنۡ يُّعۡرَفۡنَ فَلَا يُؤۡذَيۡنَ (33:59)۔ اس سے تم پہچانی جاؤ گی (کہ تم شریف عورتیں ہو) اور یہ لوگ تمہیں ستائیں گے نہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر تمہاری اسی احتیاطی تدبیر کے بعد بھی یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے مجرموں جیسا برتاؤ کرو (33:60)۔

اس ایک واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم میں عورتوں کے گھروں میں رہنے اور باہر نکلتے وقت خاص احتیاط برتنے کی تلقین اور تاکید اس معاشرہ کے خصوصی حالات کا تقاضا تھی۔ یہ ابدی اور غیر متبدل احکام نہیں تھے۔ اصل چیز قرآنی تعلیم کی روح اور بنیاد ہے۔ وہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گی اور اس پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ جس طرح (مثلاً) جنگ کی ضرورت کی روح اور اصول تو ابدی و غیر متبدل ہیں۔ جنگ لڑنے کے طور طریق اور ذرائع و آلات زمانے کے ساتھ بدلتے رہنے والے۔

اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں پردہ کے متعلق قرآنی احکام و تعلیمات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گی۔

تحفظِ عصمت:

جنسیات کے متعلق قرآنی تعلیم کی روح۔ اس کا اصل الاصول' تحفظ عصمت ہے جو قرآن کی متعین کردہ مستقل قدر ہے وہ اس کا تقاضا مردوں اور عورتوں دونوں سے کرتا ہے...... بلکہ مردوں کا نام پہلے لیتا ہے وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ (24:30) اور عورتوں کا بعد میں وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ (24:31)۔ وہ مومن مردوں اور عورتوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وَالۡحٰفِظِيۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ (33:35)۔ ''اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور ایسا کرنے والی عورتیں''۔ لیکن ہمارے ہاں تحفظ عصمت کا مطالبہ عورتوں سے کیا جاتا ہے' مردوں سے نہیں۔ حتیٰ کہ عصمت کا لفظ بھی عورتوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ باعصمت یا اس کے برعکس' عصمت فروش' عورت ہوتی ہے' مرد نہیں۔ عورتوں کے تحفظ عصمت کے لئے تو آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں لیکن مردوں سے تحفظ عصمت کے مطالبہ کے لئے کوئی تحریک نہیں چلائی جاتی۔

بداخلاقی پھیلانے کا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟

مذہبی حلقہ کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بھی عام کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں بداخلاقی پھیلانے کی ذمہ دار عورتیں ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مرد' بدکرداری کے لئے عورتوں کی طرف رجوع نہ کریں' تو عورتوں کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اگر کوئی بدنیت عورت' مردوں کے لئے بدکاری کی کشش بھی پیدا کرے' تو اگر مرد مستقل مزاج ہوں تو ان کی کشش و دعوت بھی بدکرداری نہیں پھیلا سکتی۔ بدکرداری کا عملی ارتکاب مرد ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مرد اس حقیقت کو تسلیم کریں۔ ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ بداخلاقی عورتیں پھیلاتی ہیں۔

مردوں کا ایمان متزلزل ہوجاتا ہے:

عورتوں کو گھروں کے اندر بند کر دینے کے جواز میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ان کے باہر نکلنے سے مردوں کا ایمان متزلزل ہوجاتا ہے۔ ہم جب بھی اس دلیل کو سنتے ہیں' شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتے ہیں کہ مردوں کا ایمان اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ عورت کو دیکھنے سے متزلزل ہوجاتا ہے۔ تف ہے ایسے ایمان پر جو اس قدر کمزور ہو! ایسے کمزور ایمان کو ایمان کہنا' لفظ ایمان کی تذلیل ہے۔ اگلے دنوں ایک معزز خاتون کو کہتے سنا گیا کہ اس سے پہلے ہمارے ذمے جو فرائض عائد کئے جاتے تھے' ان میں اب ایک اور کا اضافہ ہوگیا ہے وہ یہ کہ مردوں کے ایمان کو قائم رکھنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ ہمیں گھروں میں بند رہنا چاہئے تاکہ مردوں کا ایمان نہ بگڑے!! قرآن کریم نے اس کے لئے بطور حفظ ماتقدم یہ تدبیر بتائی کہ جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ اور یہ سن کر آپ متعجب ہوں گے کہ اس نے پہلے یہ تلقین مردوں کو کی ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (24:30)۔ اور بعد میں عورتوں سے۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (24:31) لیکن مردوں کو اس کی توفیق کہاں کہ وہ اپنے آپ پر اتنا ضبط کر سکیں۔ کچھ سال ادھر کی بات ہے' پرویز صاحب کے درس قرآن میں سندھ کے ایک (بڑے) مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ درس میں حسب معمول ایک طرف تمکنت اور متانت بر جبین' کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ مولوی صاحب نے کچھ وقت کے لئے تو ضبط کیا لیکن پھر کھڑے ہوکر با آواز بلند کہا کہ ان ''میم صاحبوں'' کو پردے کے پیچھے بٹھاؤ۔ ہمارا ایمان خراب ہو رہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ان کی طرف نہ دیکھیں۔ کہا کہ ایسا کرنا مشکل ہے۔ سامعین نے اصرار کیا کہ وہ کمرے کے اندر تشریف لے جائیں۔ وہ طوعاً و کرہاً اندر چلے تو گئے لیکن چند ہی منٹوں کے بعد بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئے کہ ان چھوکریوں نے ہماری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے انہیں اندر بٹھانا چاہئے''۔ مردوں کو ایمان بڑا عزیز ہے۔ اور اس کے قائم رہنے کا ایک ہی طریق ہے کہ عورتیں گھروں کے اندر بند رہیں۔

نظر بندی:

عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جسے قرآن ان عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے کچھ بے حیائی کے آثار مترشح ہو رہے ہوں۔ یعنی وہ زنا کی مرتکب تو نہ ہوئی ہوں البتہ ان سے ایسی حرکات نمودار ہوں جو ناجائز جنسی تعلقات کی طرف لے جانے والی ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (4:15)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکات سرزد ہوں (جو زنا کی طرف لے جانے کا) موجب بن سکتی ہوں' تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ۔ (اگر اس طرح جرم ثابت ہوجائے گا تو) انہیں

گھروں سے باہر آنے سے روک دو تا آنکہ انہیں موت آ جائے یا خدا کا قانون ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رک جائیں۔

اس وقت اس آیت کے دیگر مضمرات سے بحث مقصود نہیں۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دینا قرآن کریم کی رو سے جرمِ فحاشی کی سزا ہے۔

☆......☆......☆

ہم نے زمانہ قبل از اسلام (عہد جاہلیت) کے عربوں کی تمدنی اور معاشرتی سطح کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لایئے جس سے یہ حقیقت بار دگر واضح ہو جائے گی کہ ان کے عادات و اطوار کس قسم کے تھے۔ عہد رسالت مآب کے مسلمان مرد اور عورتیں بھی۔ اسی فضاء کے پروردہ تھے۔ قرآن کے پیش نظر ان کی (دل کی گہرائیوں، بلکہ تحت الشعور تک میں جاگزیں) عادات و اطوار کی ایسی اصلاح تھی کہ وہ رفتہ رفتہ قرآنی قالب میں ڈھل جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے بعض اوقات ایسی پابندیاں عائد کرنے کی بھی ضرورت تھی جو عام حالات میں قدرے سخت نظر آئیں۔ اس پس منظر میں قرآن کے اصلاحی اقدامات کا جائزہ لینا چاہئے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں اسی قسم کی اصلاحی تدابیر کا ذکر ہے۔ اس اصلاحی پروگرام کا آغاز خود حضورؐ کی اہل خانہ خواتین (نساء النبیؐ) سے کیا کیونکہ ان کی زندگی کو دوسری عورتوں کے لئے ماڈل بننا تھا۔ اسی لئے ان سے کہا گیا کہ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (33:32) تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ ان سے کہا کہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (33:33)۔ تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھر میں رہو۔ تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (33:33)۔ برج کا مفہوم تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ یہاں یہ دیکھئے کہ ہم نے جو کہا تھا کہ قرآن کے پیش نظر ان مردوں اور عورتوں کے زمانہ جاہلیت کے اطوار و کردار کی اصلاح تھی اس کی تائید آیت کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے۔ یعنی ان سے کہا گیا کہ وہ زمانہ جاہلیت کا سا تبرجانہ انداز اختیار نہ کریں۔

انہیں گھروں میں باوقار طور پر رہنے کا سلیقہ سکھایا گیا۔ پھر کہا کہ: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ (33:32)۔ اگر تمہیں کسی غیر محرم سے بات کرنی ہو تو اپنی آواز میں ایسی نرمی اور لوچ نہ پیدا ہونے دو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو غلط قسم کی آرزوئیں بیدار ہو جائیں۔ اس سے قاعدے کے مطابق عمدہ طریق سے بات کرو۔

اس آیت میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ نساء النبی ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ تم بات بھی اس انداز سے کرو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو غلط آرزوئیں نہ بیدار ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہد جاہلیہ کے افراد معاشرہ کے قلب و نظر میں کس قسم کی آلودگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ان کی اصلاح کے لئے کس انداز کی تدابیر کی ضرورت تھی۔

زیب وزینت:

قرآن کریم، زیب وزینت (تحسین حسن) (یعنی فطرت کی ہر شے کا حسن) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ اس کے لئے (کم از کم) پرویز صاحب کا وہ مقالہ دیکھ لینا چاہیے جو آرٹ اور اسلام، کے عنوان سے، طلوع اسلام بابت جولائی 1979ء میں شائع ہوا تھا اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے زینت و آرائش کے متعلق کیا کہا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ (7:32)

اے رسولؐ! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان اشیاء کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور خوشگوار سامان رزق کو حرام قرار دے؟

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آرائش وزیبائش کو ممنوع قرار دینے والوں کو کس تحدی سے چیلنج کیا ہے؟ لہٰذا عورتوں (اور مردوں) کے لئے زیب وزینت کو کوئی ناجائز نہیں قرار دے سکتا۔

لیکن زیب وزینت کو اپنے جذبہ تحسین حسن (AESTHETIC SENSE) کی تسکین کا ذریعہ قرار دینے اور اس کی نمود ونمائش کرنے میں بڑا فرق ہے۔ عہد جاہلیہ میں اسے نمود حسن کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس جذبہ کی اصلاح کی۔ اس کے لئے اس نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ بڑا جامع ہے۔ اس نے کہا کہ:

وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِيَّةِ الۡاُوۡلٰى (33:33) تم زیب وزینت کو عہد جاہلیہ کے جذبہ تبرج کی تسکین کا ذریعہ نہ بناؤ۔

تبرج کا مادہ (ب رج) ہے جس کے بنیادی معنی ابھارنے کے ہیں۔ (لفظ برج) سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی)۔ اسی کو نمود اور نمائش کہتے ہیں۔ لیکن اس کا نفسیاتی مفہوم اس سے گہرا ہے۔ تَبَرُّجَ اس بلونی یا مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلویا جاتا ہے۔ دودھ بلونے سے اس میں جس قدر تحرک اور تلاطم پیدا ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ لہٰذا، برج اس قسم کے نمود حسن اور نمائشِ زینت کو کہیں گے جس سے ان مردوں۔ کے سینے میں، جن کا قلب ونگاہ آلودہ ہو، جذبات کا تلاطم برپا ہو جائے۔ عہد جاہلیہ میں نمودِ حسن وآرائش سے یہی مقصود تھا قرآن نے اسی سے منع کیا ہے، یعنی بالا رادہ نمودِ حسن وزینت۔ اسی لئے کہا کہ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا (24:31) وہ اپنی زینت کو بالارادہ نمایاں نہ کریں۔ جو از خود ظاہر ہو جائے اس کا مضائقہ نہیں۔

ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ قرآن نے کن حالات کے تحت عورتوں کو جلباب کے پہننے کی تلقین کی تھی۔ یہاں کہا وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ (24:31)۔ انہیں چاہئے کہ اپنے اوڑھنے کی چادریں اپنے سینہ پر ڈال لیا کریں۔ اس باب میں اس حد تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ (کہا کہ) وہ چلیں تو اس انداز سے کہ پوشیدہ زینت (پاؤں کے زیور وغیرہ) کی جھنکار بھی سنائی نہ دے۔ وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ ؕ (24:31)۔

لیکن ان تاکیدات سے مقصد زیب وزینت کی مخالفت نہیں۔ ان احکامات کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ (عورتیں) اپنی زینت کو نمایاں نہ ہونے دیں، بجز اپنے خاوندوں۔ اپنے باپ' سسر' اپنے بیٹے یا خاوند کے بیٹے (یعنی حقیقی یا سوتیلے بیٹے) بھائی' بھتیجے' بھانجے' اپنی (جانی پہچانی) عورتوں یا ان غلام اورلونڈیوں کے (جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں کام کاج کیا کرتے تھے)۔ یا دیگر خدمت گاروں میں سے ایسے سن رسیدہ جو جنسی خواہشات سے گزر چکے ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کی پردے کی باتوں (جنسیات) سے نا آشنا ہوں۔ یعنی ان کے سامنے نمود زینت میں کوئی مضائقہ نہیں (24:31)۔

اظہار و نمود زینت کے علاوہ اس نے پرائیویسی کا بھی ایسا خیال رکھا ہے کہ بچوں اور ملازموں کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ صبح تمہارے اٹھنے (صلوٰۃ الفجر) سے پہلے۔ دوپہر کے وقت جب تم آرام کر رہے ہو اور رات کے وقت (صلوٰۃ العشا کے بعد) تمہارے کمرے میں آنا چاہیں تو اجازت لے کر آیا کریں (24:57)۔

تطہیر قلب ونگاہ:

یہ ہیں پردے اور ستر زینت کے متعلق قرآنی احکام وہدایات' بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان سے مقصود ان خیالات کی تطہیر اور ان عادات واطوار کی اصلاح تھا جو زمانہ قبل از اسلام (دور جاہلیہ) کی زندگی کا عام شعار تھے اور جو قرآن کے معاشرتی نظام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان احکام کا مقصد یہ بتایا۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ (33:33) ''خدا چاہتا یہ ہے کہ تم سے قلب ونظر کی آلودگی کو دور کر کے تمہاری سیرت کو پاکیزہ بنا دے''۔ جنسیات کے سلسلہ میں دین کی بنیادی غایت تحفظ عصمت ہے' اور یہ تمام احکام اسی (عصمت) کے پاسبان ہیں۔ اسلامی حکومت (مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلامی حکومت) کا فریضہ ہوگا کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لے اور پھر دیکھے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں۔ یاد رہے کہ جنسیات کی تطہیر نہ تو ڈنڈے کے زور سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی قوانین کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے۔ یہ گہرا نفسیاتی تقاضا ہے جسے دل سے ابھرنے والے خیالات کی تطہیر سے کنٹرول میں رکھا جا سکتا ہے۔ (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق ہم وقتاً فوقتاً لکھتے چلے آرہے ہیں) اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (40:19)۔ ''خدا نگاہ کی خیانتوں اور دل میں پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے''۔ خیالات سے اس تقاضا کا کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک پیش پا افتادہ مثال سے لگائیے۔ ایک آوارہ گرد نوجوان جو دن بھر کسی ''تازہ شکار'' کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے' رات کو اپنے گھر میں ایسے کمرہ میں سوتا ہے جس میں اس کی نوجوان بہن بھی ہوتی ہے۔ اس کمرے میں ہی نہیں۔ گھر بھر میں کوئی تیسرا متنفس نہیں ہوتا۔ وہ اس تنہائی میں' اپنی ہمشیرہ کے ساتھ والے پلنگ پر سوتا ہے اور دست درازی تو ایک طرف بہن کی طرف نگہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ اس جوان لڑکی کی طرف بدنگہی سے کیوں نہیں دیکھتا؟ اس لئے کہ اس کے

دل میں یہ خیال راسخ ہے کہ بہن کے خلاف آلودہ نگہی سخت معیوب ہے [1]

قرآن، اپنی عدیم النظیر تعلیم وتربیت سے اپنے نوجوانوں (لڑکوں اور لڑکیوں دونوں) کے قلب ونگاہ میں ایسی پاکیزگی پیدا کرتا ہے کہ ہر نوجوان لڑکا (اپنی بیوی کے سوا) ہر لڑکی اور عورت کو بہن سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49:10) تو اس کے معنی یہی نہیں کہ مومن مرد آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ مومن عورتیں مومن مردوں کی بہنیں ہیں۔ (قرآن کریم نے یہ لفظ بھائی اور بہن دونوں کے لئے استعمال کیا ہے) (4:177)

لہٰذا اگر مناسب تعلیم وتربیت سے، قلب ونظر کی تطہیر ہو جائے تو یہ سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی قانون یا کوئی تدبیر اس کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ایسی تطہیر نہ ہو، اور جنسی جذبات بیباک ہوں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پری رُو تابِ مستوری ندارند
چو دربندی، ز روزن سَر برآرند

(پَری جیسے چہرہ والے چُھپے رہنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر تو انہیں کمرے میں بند کر کے دروازہ بند کر دے تو وہ روشن دان سے جھانکنا تاکنا شروع ہو جاتے ہیں۔

(ترجمہ از سلیم)

حرفِ آخر:

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ وہ بنیادی اصول جس پر یہ تمام عمارت استوار ہوتی ہے، آخر میں بیان کی جائے گی۔ اور وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن، پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، وہی جنت میں جا سکے گا۔ غیر بنی اسرائیل جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ یہ پیدائش کی رو سے، انسان اور انسان میں بڑی بنیادی تفریق تھی۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، یا غیر بنی اسرائیل کے گھرانے میں۔ غیر بنی اسرائیل کو ایک ایسے جرم کی سزا دینا جو اس کے بس کی بات ہی نہیں، خدا کے شایانِ شان نہیں۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور تاوقتیکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے، وہ جنت کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی بچہ اپنے اختیار وارادہ سے دنیا میں نہیں آتا۔ اس لئے انہیں اس بات کی سزا دینا کہ وہ انسانوں کے گھر کیوں پیدا ہوئے ہیں، اصول عدل کے یکسر خلاف ہے۔

---

(1) (SEX PERVERTION) کی بات الگ ہے۔ وہ انتہائی شدید نفسیاتی مرض کی علامت ہوتی ہے جس کا تعلق مستثنیات (EXCEPTIONS) سے ہوتا ہے۔ ہم اوپر کی مثال میں معمولات سے بحث کر رہے ہیں۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان پیدائش کی رو سے چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم ہوتے ہیں۔ برہمن (برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں) اس لئے ہر قسم کی عزت وتکریم' بلکہ اقتدار کے مستحق ہیں۔

کھشتری......(برہما کے بازوؤں سے پیدا ہونے کی وجہ سے) تخت وتاج کے وارث ہوتے ہیں۔

ویش......(برہما کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) وہ کاروبار (بیوپار وغیرہ) کا کام کریں گے اور

شودر......(برہما کے پاؤں سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) ان کا فریضہ باقی ورتوں (بالخصوص برہمنوں) کی خدمت گزاری ہے۔ انہیں درجہ انسانیت حاصل ہی نہیں۔

اس تقسیم وتفریق کو بدلنے کا کسی کو حق حاصل نہیں......آپ غور کیجئے کہ اس تفریق وتقسیم کو برہما (خدا) کی طرف منسوب کرنے سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟

قرآن آیا اور اس نے بیک کلمہ (ابدی اصول) باطل کے ان تمام عقائد پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ اس نے کہا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)

ہم نے تمام انسانوں کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

اس لئے پیدائش کے اعتبار سے کسی انسانی بچہ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ خدا نے جس تعظیم وتکریم کا حامل ''انسان'' کو ٹھہرایا ہے۔ اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ''انسان'' میں مرد اور عورتیں' دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے جو کچھ ''انسان'' (یا الناس) کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق مردوں اور عورتوں دونوں پر ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی لڑکا اپنے اختیار وارادہ سے لڑکا پیدا ہوتا ہے' نہ کوئی لڑکی اپنے انتخاب (CHOICE) سے لڑکی۔ اب' لڑکی (یعنی عورت) کو لڑکے (یعنی مرد) سے کسی اعتبار سے بھی پست (INFERIOR) سمجھنا' پیدائشی تفریق کے اسی باطل عقیدہ کی طرف لوٹ جانے کے مرادف ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ بنابریں، مردوں کو عورتوں سے افضل سمجھنا' قرآن کے اصل الاصول کے خلاف اور منشاء خداوندی کے منافی ہے۔ قرآن کی رو سے' افضیلت' جوہر ذاتی (حسن سیرت وکردار اور اعمال) کی رو سے حاصل ہوتی ہے' نہ کہ پیدائش کی رو سے۔ اور اس اصل الاصول میں مرد اور عورتیں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ تمام خیالات وعقائد جن کی رو سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں جنس کاسد سمجھا جاتا ہے' اس ''اسلام'' کے پیدا کردہ ہیں جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا' جس میں عورتیں منڈیوں میں نیلام ہوا کرتی تھیں۔ ہماری فقہ کی کتابیں' عورتوں کی خرید وفروخت سے متعلق ''مسائل'' سے بھری پڑی ہیں۔

قرآن کریم نے نمود زینت کو جو مستحسن قرار نہیں دیا' تو اس میں بھی عورتوں کے شرف ومجد کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عیسائیت (اور یہودیت) میں عورت کی تخلیق (یعنی آدم کی پسلی سے پیدا ہونے) کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آدم (مرد) کے بہلاوے کا ذریعہ بن سکے۔ یعنی ان کے نزدیک عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ آدم (مرد) کے ایک تقاضا کو

پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے مرد کے کھلونے کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔۔

قرآن کریم نے اس باطل تصور کو بھی مٹایا اور کہا کہ مرد اور عورت دونوں کی تخلیق مقصود بالذات ہے......نہ مرد عورت کے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، نہ عورت، مرد کے کسی مقصد کے پورا کرنے کا ذریعہ۔ یہ دونوں خدا کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے یکساں ذریعے ہیں۔

عورت کا مقام بلند:

قرآن نے تو یہ بتایا۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورت کے دل میں اس خیال کو کوٹ کوٹ کر بھرا گیا کہ اس کی تخلیق مقصود بالذات نہیں، بلکہ مردوں کے ایک تقاضا کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے غیر شعوری طور پر یہ خیال عورت کے تحت الشعور میں جا گزیں ہو گیا کہ اس کا مقصدِ حیات مردوں کا کھلونا بننا ہے۔ عورت کی طرف سے غیر مردوں کے سامنے، حسن و زینت کی نمود کا جذبہ، غیر شعوری طور پر اس تقاضا کا پیدا کردہ ہے کہ وہ ان کی نگاہوں میں پرکشش بن جائے۔ آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم نے جو باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کے سامنے نمود زینت کو معیوب قرار نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے نمود حسن کا جذبہ پرکشش بننا نہیں ہوتا۔ آپ ذرا قرآن کی ان باریکیوں کو بنگاہ تعمق دیکھئے کہ اس نے نمود حسن و نمائش زینت کے خلاف احکامات کے ملحق (دوسری ہی آیت میں) عورتوں سے کہا ہے کہ تم تو زندگی کے کسی گوشے میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہو، اس لئے تمہارے دل میں مردوں کا کھلونا بننے کا جذبہ کیوں کارفرما ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

اس نے کہا کہ:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾ (33:35)

یاد رکھو! ہم نے مردوں اور عورتوں، دونوں میں اس امر کی استعداد رکھ دی ہے کہ وہ

1- قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوں۔

2- ان قوانین کی محض میکانکی طور پر اطاعت نہ کریں، بلکہ دل کی گہرائیوں میں، ان کی صداقت اور نتیجہ خیزی پر ایمان رکھیں۔

3- اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے، انہیں صرف وہاں صرف کریں، جہاں صرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ملے۔

4- وہ عہد جو انہوں نے اپنے خدا سے باندھا ہے (9:11)، اسے سچ کر دکھائیں۔

5- مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہیں۔

6- نوعِ انسان کی خدمت کے لئے شاخ ثمر دار کی طرح جھکے رہیں۔

7- اپنی ہر متاع کو نظامِ خداوندی پر نچھاور کر دینے کے لئے تیار رہوں۔

8- قوانین خداوندی نے جہاں جہاں سے رکنے کا حکم دیا ہے، وہاں سے رکیں۔

ان پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان کا پورا پورا خیال رکھیں۔

9- اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری حفاظت کریں۔

10- غرضیکہ زندگی کے ہر قدم پر، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جنہیں خدا کا قانونِ مکافات، زندگی کی ہر تباہی سے محفوظ رکھے گا۔ اور انہیں، ان کی سعی و عمل کا اجر عظیم عطا کرے گا۔ اس باب میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں (4:124; 3:194)۔

قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ مرد اور عورتیں کارگاہ حیات میں یکساں صلاحیتوں اور استعدادوں کی مالک ہیں، پھر تمہارے دل میں یہ جذبہ کیوں بیدار ہو کہ تم نمائشِ زینت سے مردوں کی نگاہ میں پرکشش بنو۔ تم کوئی جنس (COMMODITY) نہیں جسے خریداروں کے لئے پرکشش بنا دیا جاتا ہے کہ اس کی قیمت بڑھ جائے۔ جو عورتیں اس کے باوجود اپنے دل سے اس خیال کو نکال نہ سکیں وہ ان سے کہتا ہے کہ:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (7:176)

ہم تو چاہتے تھے کہ تمہیں، قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں، لیکن تم ہو کہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر زمین کی پستیوں کے ساتھ چپکے رہنا چاہتی ہو۔

یعنی ان کے لئے خدا کا پیغام یہ ہے کہ:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو!
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت "کر گئی!"
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے۔

اور یہی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر شاکر حسین خان
(شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی)

عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے علامہ پرویزؒ کی علمی و فکری خدمات

اللہ رب العٰلمین نے انسانوں کی بھلائی اور رہبری کے لیے نبوت کا سلسلہ جاری فرمایا، تا کہ انبیاء اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب کو ہر صورت میں نافذ کریں۔ اس لیے دین کا واحد ماخذ نبی پر نازل ہونے والی کتاب ہوئی۔ اگر ہم عصر حاضر میں اسلام کے حقیقی ماخذ قرآن مجید اور دیگر سورسز (Sources) سے بھی محمد رسول اللہ (سلام علیہ) کی نبوت کا جائزہ لیں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچے گی کہ سلسلۂ نبوت کے آخری نبی، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (سلام علیہم)' اور آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ پیشِ نظر مقالے میں ہم اسی عقیدہ ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے علامہ چوہدری غلام احمد پرویزؒ کی پیش کی گئی علمی و فکری خدمات کا جائزہ لیں گے۔

علامہ چوہدری غلام احمد پرویزؒ کی شخصیت، کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ان کی پیدائش 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداس پور کے قصبہ ''بٹالہ'' میں ہوئی۔ان کے دادا جان، امولوی چوہدری حکیم رحیم بخشؒ، حنفی مسلک کے ایک جیّد عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے، وہ پرویز صاحب کو اپنے علم وسلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے۔ بقول پرویز صاحبؒ کے اس لیے انہوں نے شروع ہی سے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا اور میری پرورش، تربیت اور تعلیم انہی کے ہاتھوں یا زیرِ نگرانی ہوئی۔[1]

علامہ پرویزؒ لکھتے ہیں ''علامہ محمد اقبالؒ سے میرا ذہنی تعارف بہت پہلے ہو چکا تھا۔۔۔دادا جان نے لاہور میں دو بزرگوں سے ملنے کے لیے کہا تھا ایک امام الدین نجار اور دوسرے علامہ محمد اقبالؒ۔۔۔ فیضانِ اقبالؒ سے یہ حقیقت بھی میری سمجھ آئی کہ ''قرآن کریم'' سمجھنے کا طریق ''محاورۂ عرب'' اور ''تصریفِ آیات'' ہے۔۔۔اس مقام پر یہ مناسب نہیں کہ میں استاذی المکرم حافظ محمد اسلم جیراج پوریؒ کا ذکر نہ کروں جن کی مشفقانہ حوصلہ افزائی میرے لیے موجب ہزار تقویت بنتی رہی۔''[2]

ماہنامہ طلوع اسلام، لاہور، کے ہر شمارے کے سرورق (Title Page) پر تحریر ہوتا ہے کہ ''علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظم کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ۔'' اس ماہنامہ کا نام علامہ محمد اقبالؒ کا رکھا ہوا ہے۔ اور یہ

---

(1) پرویزؒ، شاہکارِ رسالت، ص:1 (2) ایضاً، ص:6 تا 9

1935ء میں سید نذیر مرحوم کی زیرِ ادارت شائع ہوتا رہا۔ 1938ء سے اس کے دورِ ثانی کا آغاز ہوا تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے ''ادارہ طلوعِ اسلام'' کا نام اسی ماہنامہ کی نسبت سے رکھا گیا۔ اقبالؒ کی ایک نظم کا نام بھی ''طلوعِ اسلام'' ہے۔ علامہ پرویزؒ، تحریک پاکستان کے ایک کارکن اور اسی سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ذاتی مشیر بھی رہے، متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ 24 فروری 1985ء کو (لاہور) میں وفات پائی۔(1) اس مختصر تعارف کے بعد ہم ان کی عقیدہ ختمِ نبوّت کے تحفظ کے لیے پیش کی گئی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ ''نبی'' کا معنی و مفہوم تحریر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں'' نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو گوشے ہیں۔ نبی رسول ہوتا ہے اور رسول نبی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی وہ ہے جسے کتاب (یعنی شریعت) نہ ملے اور رسول صاحبِ شریعت (صاحبِ کتاب) کو کہتے ہیں تو یہ تمیز قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے ہر رسول کو کتاب ملی یعنی ہر نبی کو کتاب ملی تھی، نبوت کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوگیا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو اللہ کی طرف سے براہِ راست علم نہیں مل سکتا (خواہ اس کا نام وحی رکھ لیا جائے یا کشف و الہام یا کچھ اور)۔ اب علمِ انسانی کے دو ہی ذرائع ہیں، وہ وحی جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور وہ علم جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے عام قواعد کے مطابق حاصل کرتا ہے۔ اسے ختمِ نبوّت کہتے ہیں۔''(2)

علامہ پرویزؒ کے بقول کہ ''ہر نبی کو کتاب ملی تھی'' درجہ ذیل آیات کے مطابق درست ثابت ہوتا ہے۔ وہ آیات آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213) ترجمہ ''اللہ نے مبعوث فرمایا انبیاء کو مبشر و منذر کی حیثیت سے اور اُن سب پر کتاب بھی نازل کی'' اور فرمایا گیا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (3:81) ترجمہ ''اور یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تم سب کو کتاب و حکمت دونگا''۔

اور فرمایا گیا:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ (4:163) ترجمہ ''بیشک ہم نے وحی کی آپ پر جس طرح ہم نے نوح اور اُن کے بعد والے نبیوں پر کی تھی''۔

علامہ پرویزؒ مزید لکھتے ہیں: '' ایک ہی شخص کو کبھی نبی کہا جاتا تھا کبھی رسول۔ نبوت (یعنی اللہ کی طرف سے وحی کا پانا) ذاتِ نبی اکرم ﷺ پر ختم ہوگئی (اس لیے ہم نے اوپر ماضی کے صیغے استعمال کیے ہیں) لیکن جو وحی حضور ﷺ کو ملی تھی، وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے۔''(3)

---

(1) پرویزؒ، ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیت سرورق کا پچھلا حصہ، (2) پرویزؒ تبویب القرآن ص:974 (3) ایضاً ص:604

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''نبوّت کا خاتمہ (عرب ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں) نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر آ کر ختم ہو گیا۔ حضور ﷺ کے بعد دنیا میں کوئی نبی (یا رسولؑ) اللہ کی طرف سے نہیں آ سکتا۔ اب نبوّت یا رسالت اپنی اصل شکل میں قرآن کے اندر ہے جو تمام نوع انسان کے لیے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے والا اس کا مکلف ہے کہ وہ اصولی طور پر تو تمام سابقہ انبیاء (رسولوں) کی صداقت پر ایمان لائے یعنی اسے تسلیم کرے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے سچے رسول تھے۔ لیکن اب ساری دنیا کے لیے رسول، حضور خاتم النبیّن ﷺ ہی ہیں۔''[1]

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا سلسلہ حضور ﷺ کے بعد ختم ہو گیا، اس لیے اب کسی کا یہ دعویٰ کہ اسے اللہ کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) دعوٰے نبوّت ہے اور ختمِ نبوّت کے منافی۔''[2] راقم کے خیال میں، علامہ پرویزؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو مختلف نظریات قائم ہو گئے ہیں مثلاً، محدث، مجدد، امام غائب، مسیح موعود، یا اہل تصوف میں غوث، قطب، ابدال وغیرہ کے نظریات سب عقیدہ ختمِ نبوّت کے خلاف ہیں۔ ہماری اس رائے کی تائید علامہ پرویزؒ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ رقم کرتے ہیں کہ ''اگر فطرت کے پروگرام میں یہی ہوتا کہ انسانی معاشرہ میں انقلاب اشخاص ہی کا محتاج رہے گا تو انبیاء کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔ مشیتِ خداوندی نے افراد کی جگہ آئیڈیالوجی کو دیدی۔ لیکن عام مسلمانوں کے نزدیک خدا کا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) ٹھیک نہ تھا۔ انہوں نے ختمِ نبوت کے باوجود، اشخاص کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے علماء کو، کانبیاء بنی اسرائیل، بنا کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جو ان کے ذہن میں ختم نبوت کی رو سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ہر صدی پر ایک مجدد کو بلا یا گیا کہ خدائی پروگرام کے اس نقص کو وہی آ کر پورا کرے۔ اس سے بھی ہوس اشخاص پرستی کی تسکین نہ ہوئی تو ایک آخری نجات دہندہ (مہدی آخرالزماں) کا انتظار کرنے لگے۔ تم نے غور کیا سلیم کہ مسلمان نے کس طرح ختمِ نبوت کی حقیقت سے عملاً انکار کیا۔''[3]

علامہ پرویزؒ اپنی معروف کتاب ''سلیم کے نام'' کے مقدمہ میں چودھویں خط کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں ''اس خط میں ضمناً ختمِ نبوّت کا بھی ذکر آ گیا ہے ''ختمِ نبوّت'' سے ہمارے ہاں صرف اتنا ہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ '' مرزا غلام احمد، سچّا تھا یا جھوٹا'' حالاں کہ یہ انسانی دنیا کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس کا تعلق زندگی کے اہم گوشوں سے ہے لیکن یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک پہلے خود مقامِ نبوّت اور مقامِ رسالت کی ماہیت سمجھ میں نہ آ جائے اور یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ ان کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔ پندرھویں اور سولہویں خط میں انہی عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔''[4]

چودھویں خط کا دوسرا عنوان ہے ''ختمِ نبوّت کا مفہوم'' اس خط کے آخر میں درج ہے ''اپریل 1951ء۔''[5] علامہ

(1) تبویب القرآن، ص: 605 (2) ایضاً (3) سلیم کے نام خطوط، ص: 235۔236 (4) ایضاً، ص: 6 (5) ایضاً، ص: 239

پرویزؒ مذکورہ خط میں تحریر کرتے ہیں ''مسلمانوں نے ختمِ نبوت کے عقیدے کے باوجود اشخاص کے بجائے آئیڈیالوجی (رسالت) کو درخورِ امامت نہیں سمجھا۔''(1) پندرہویں خط کا عنوان ہے ''مقامِ محمدی ﷺ'' جو، جنوری 1953ء کو تحریر کیا گیا۔(2) اس خط کے حوالے سے مزید گفتگو ماہ فروری میں کی گئی۔(3) جب کہ سولھویں خط کا عنوان ہے ''مقامِ رسالت'' اس پر بھی ماہِ فروری 1953ء درج ہے۔(4)

رسول ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق، علامہ پرویزؒ کی کتاب ''معراجِ انسانیت'' جس میں ''عقیدہ ختمِ نبوّت'' کے متعلق پُر مغز اور حکمت سے لبریز مقالہ ہے اس کے چند اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے۔ علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''حضور ﷺ نے ایک انسان کی حیثیت جس قدر بلند سیرت و کردار کا نمونہ پیش کیا، وہ اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ یہ کچھ ایک انسان نے کیا تھا۔ اِس لیے جو انسان بھی چاہے ان نقوشِ قدم پر چل کر یہی کچھ کرنے کے قابل بن سکتا ہے۔ وہ مقام نبوت تک تو نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ وہ ''خالصۃً وہبی عطا تھا۔''(5)

محترم پرویزؒ ''ختمِ نبوت'' کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں ''آپ ﷺ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پالیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوّت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اُس نے خود اپنی خاتمیّت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے عہدِ طفولیّت کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کا دیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے۔ اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علمِ انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختمِ نبوّت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔ پھر عقیدۂ ختمِ نبوّت کی ایک بڑی اہمیّت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات (Mystic Experiences) کے متعلّق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرزِ عمل قائم ہوتا ہے۔ اس لیے ختمِ نبوّت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدّعی نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (Supernatural Authority) کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرسکتا ہے۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوّت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اب کسی کے باطنی مشاہدات کیسے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں، ان پر اسی طرح تنقیدی نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔ جس طرح انسانی مشاہدات کے دوسرے پہلوؤں پر۔''(6)

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''اسلامی نظامِ زندگی یا حکومتِ خداوندی جسے سب سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ نے متشکّل فرمایا اور جسے حضور ﷺ کے سچّے جانشینوں نے قائم رکھا اور آگے بڑھایا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس نظام میں شخصیّتیں آتی رہیں

---

(1) سلیم کے نام خطوط، ص: 236، (2) ایضاً ص: 253 (3) ایضاً ص: 261

(4) ایضاً ص: 281 (5) معراجِ انسانیت ص: 437 (6) ایضاً ص: 438

گی اور جاتی رہیں گی۔ ان کے جانے سے اس نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کا اعلان جناب صدیقِ اکبرؓ نے حضور ﷺ کی وفات پر فرمایا تھا۔ جہاں تک خدا سے وحی پانے کا تعلّق تھا، وہ حضور ﷺ کی ذات پر ختم ہوگیا۔ جہاں تک وحی کے مُطابق انسانی معاشرہ کو چلانا تھا، وہ حضور ﷺ کے بعد بھی جاری رہا۔ اس نظام کو چلانے کے لیے کسی نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے (قرآن کو محفوظ کر دینے کے بعد) نبوّت کا خاتمہ کر دیا گیا اور اسلامی نظام کو قائم رکھنے اور آگے چلانے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ اس نظام کو مرکزی اتھارٹی (جسے مرکزِ ملّت سے تعبیر کیا جاتا ہے) نبی اکرم ﷺ کے بعد قرآنی احکام وقوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ تھی۔ اس کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن اور خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت (اسلامی نظام کے) دو ستون ہیں جن پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ قرآن کریم نے جو نظامِ دین عطا کیا ہے یعنی قرآن بطور اساسِ آئین اور ملّت کی مرکزیّت اس کی قوّتِ نافذہ، اس کی موجودگی میں نبوّت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ختمِ نبوّت کا عقیدہ اتنا واضح تھا کہ جس طرح توحیدِ خداوندی کے متعلّق کسی بحث کی گنجائش نہ تھی اسی طرح اس کے متعلّق بھی کسی سوال ضرورت باقی نہ تھی۔ آپ قرنِ اوّل کے تمام مخطوطات چھان ڈالیئے، آپ کو کہیں کسی جگہ بھی اس مسئلہ کے متعلّق کوئی بحث نہیں ملے گی۔ اُن کے نزدیک نبوّت کی ختمیّت، خدا کی وحدت کی طرح مسلّم تھی۔ کسی دل میں نہ اس کے متعلّق کوئی سوال پیدا ہوُا نہ اُس کے متعلّق۔ نبوّت قرآن میں محفوظ تھی اور حضور ﷺ کی امامت، مرکزِ ملّت کی شکل میں موجود۔ اس لیے اجرائے نبوّت کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک کسی ''آنے والے'' کا تصوّر ہی بے معنی تھا۔ جب تک اسلامی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت) کا سلسلہ قائم رہا کسی ''آنے والے'' کا تصوّر، ہمارے ہاں بار نہ پاسکا۔ لیکن جب، ہماری بدقسمتی سے، یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، تو قوم رفتہ رفتہ مذلت میں گرتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ شخصیّتوں کے سہارے ڈھونڈنے لگی۔''(1)

علامہ پرویزؒ ''آنے والے'' کا تصوّر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ایک ''آنے والے'' کا تصوّر، ہمارے اسی دورِ نکبت وزوال کا پیدا کردہ ہے۔ اس عقیدہ کی قرآن کریم میں کہیں گنجائش نہیں۔ اس سے ختمِ نبوّت کا اعلان بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔''(2)

علامہ پرویزؒ مزید لکھتے ہیں ''ختمِ نبوّت کی مہر کو توڑنے کے لیے ''آنے والے'' کے عقیدے کے علاوہ، ایک اور عقیدہ بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ ''آنے والے'' کے عقیدہ کی صُورت یہ ہے کہ مُسلمان اس پر عقیدہ تو ضرور رکھتا ہے لیکن جب بھی کوئی اس کا دعوٰی کرتا ہے کہ جس ''آنے والے'' کا تمہیں انتظار ہے وہ میں ہوں، تو اس کے دعوے کی مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دوسرا عقیدہ ایسا ہے جس کے مدّعی کی کہیں سے مخالفت نہیں ہوتی اور پوری اُمّت اس کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ عقیدہ ہے کشف والہام کا جس پر تصوّف کی ساری عمارت استوار ہے اور جو ختمِ نبوّت کو

(1) معراجِ انسانیت، ص:446 تا 447 (2) ایضاً، ص:448

جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، نہ صرف یہ کہ اس کی کسی کی طرف سے کبھی مخالفت نہیں ہوتی، بلکہ اسے عین دین ہی نہیں، مغزِ دین، سمجھا جاتا۔"(1)

علامہ پرویزؒ، عقیدہ کشف والہام، کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "قرآنی کریم کی رو سے، انسانی علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ علم، انسان کو، اس کے مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، عقل وفکر، غور وخوص کے بغیر، براہِ راست خدا کی طرف سے حاصل ہوتا تھا۔ یعنی یہ علم انسانی فکر کا پیدا کردہ داخلی (Subjective) نہیں ہوتا بلکہ اُسے خارج سے (Objectively) ملتا تھا۔ یہ مخصوص تھا حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ آخری مرتبہ، حضور نبی اکرم ﷺ کو ملا اور اس کے بعد یہ ذریعہءِ علم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اسے ختمِ نبوّت (اور حضور ﷺ کو اسی جہت سے خاتم النبیّین ﷺ) کہتے ہیں۔ اس علم کا ماحصل قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا، ختمِ نبوّت کے بعد، علم انسانی کے سرچشمے دو ہی رہ گئے۔ وحی کی رو سے عطا شدہ علم، جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور انسانی عقل وفکر (جس میں مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سب شامل ہیں) لیکن تصوّف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا ذریعہ اب بھی موجود ہے۔ ختمِ نبوّت سے پہلے اسے وحی کہتے تھے، اب اسے کشف والہام کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ فرق صرف نام کا ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے۔ چنانچہ سرخیل گروہِ صوفیاء، شیخ اکبر محی الدّین ابنِ عربی، اس سلسلہ میں اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں "جس مقام سے نبی لیتے تھے (علم حاصل کرتے تھے) اس مقام سے انسانِ کامل، صاحب الزّمان غوث، قطب، لیتے ہیں۔ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن وحدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں مصرّح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن وحدیث ہوتے ہیں اس کے برعکس، ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا، خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر، مادّہ کشف والہام اور مادّہ وحی ورسول ایک ہے۔ صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقہ سے واقف ہونے کی وجہ سے، خاتم النبیّین کے موافق ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے" آپ نے غور فرمایا کہ انبیاء کی وحی اور اولیاء کے کشف والہام میں فرق صرف اصطلاحی ہے۔ (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) اصل وحقیقت دونوں کی ایک ہے، یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنا اور یہی وہ نکتہ ہے۔ جس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔"(2)

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں "جب وحی کا سلسلہ، حضور نبی اکرم ﷺ کے بعد بند ہو گیا تو پھر خدا کا بندوں سے کلام کرنے کا ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا۔ یعنی بذریعہ قرآن کریم۔ لہٰذا، ختمِ نبوّت کے بعد کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا سے براہِ راست علم حاصل کرتا ہے، یا خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، قرآن کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف اور نبوّت کے بند شدہ دروازہ کو کھولنے کے

(1) معراجِ انسانیت از پرویزؒ، ص:448 (2) ایضاً، ص:448 تا 449

مترادف ہے۔ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ صاحبِ کشف والہام اولیاء۔ ظلّی یا بروزی نبی، مسیحِ موعود، مجدّد، یا کچھ اور، اصل کے اعتبار سے بات ایک ہی ہے۔"(1)

محترم پرویزؒ لکھتے ہیں "خدا کی آخری (اور مکمّل) کتاب، قرآن کریم کی موجودگی میں یہ عقیدہ کہ کوئی شخص خدا سے براہِ راست علم حاصل کرسکتا ہے، ختمِ نبوت کے منافی، قرآنی تعلیم کے خلاف اور دوسروں سے مستعار لیاہوا ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے جو علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ تصوّف، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" اور جب کشف و الہام کا عقیدہ ہی اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے تو ختمِ نبوّت کے بعد، دعوٰے نبوّت کا تو اسلام میں تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عجیب اتّفاق ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد، مذاہبِ عالم کے متّبعین میں سے کسی نے بھی نبوّت کا دعوٰی نہیں کیا، یہ دعوٰی کیا تو خود اسلام کے مدّعیوں نے کیا! یاللعجب۔"(2)

علامہ پرویزؒ نے "وحی غیر متلو" کو بھی "ختمِ نبوّت" کے خلاف قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "کشف والہام کے عقیدہ کی طرح ایک اور عقیدہ بھی "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ وحیٔ نبوّت کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک وحیٔ متلو، اور دوسری وحیٔ غیر متلو۔"(3)

علامہ پرویزؒ مزید فرماتے ہیں "قرآن کریم میں وحی کی ان قسموں کا کوئی ذکر نہیں (حتٰی کہ کتُبِ احادیث میں بھی ان اصطلاحات متلو اور غیر متلو۔ کا کہیں ذکر نہیں ملتا)، یہ عقیدہ بھی یہودیوں کے ہاں مروّج تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ شب کتب، وحی متلو۔ اور شبِ علفہ، وحی غیر متلو۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ یہ عقیدہ کہ خدا کی طرف سے نبی کو کوئی تصوّر بلا الفاظ ملتا تھا اور اسے نبی پھر اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا، علم النفس والالسنہ کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصوّر (Concept) بلا لفظ (Word) کے آسکے۔ تصوّر اور الفاظ، لازم وملزوم ہیں۔ کیا آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ جب قرآن نے کہا کہ: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ (26:194-193) "اسے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا" تو اس کے ساتھ ہی اس کی تصریح کردی کہ: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (26:195) "واضح عربی زبان میں"۔ یعنی وحی کا القا، ہمیشہ الفاظ کے ساتھ ہوتا تھا، الفاظ کے بغیر نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وحی کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے اور اس کی تلاوت کا حکم دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ارشاد ہوا: اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ (29:45) "یہ کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر"۔ یعنی مَآ اُوْحِيَ (جو کچھ بھی وحی کیا گیا تھا) وہ متلو (جس کی تلاوت کی جائے) تھا۔ غیر متلو، وحی کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا، وحی صرف قرآن کریم ہے اور خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے آخری وحی ہے۔"(4)

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں کہ "حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصدِ جلیلہ یہ بتایا گیا کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

(1) معراجِ انسانیت از پرویزؒ ص:453 (2) ایضاً ص:454 (3) ایضاً (4) ایضاً ص:454 تا 455

وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (7:157) ''وہ ان بوجھل سلوں کو اُتار دے گا جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔'' ختم نبوّت نے ان تمام زنجیروں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا اور اس طرح انسان کو صحیح آزادی سے روشناس کر دیا۔''(1)

علامہ پرویزؒ، عقیدہ ختمِ نبوّت کی وضاحت اِن الفاظ میں تحریر کرتے ہیں کہ ''میں آپ کی توجہ ایک بار پھر اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ خدا نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ ہر طرح سے مکمل ہے، غیر متبدّل ہے۔ محفوظ ہے۔ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لیے ضابطۂ ہدایت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد ختمِ نبوّت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ جب کتاب ایسی ہے جس کے بعد قیامت تک کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں تو اس کتاب کے لانے والے نبی ﷺ کے بعد کسی اور نبی کی بھی ضرورت نہیں۔ نبی تو کتاب لے کر آتا ہے۔ جب کوئی کتاب ہی نہیں آنی تو نبی کیا کرنے آئے گا۔ کتاب دائمی، اس لیے اس کتاب کے لانے والے نبی کی نبوّت بھی دائمی۔ اس کتاب کے بعد مزید کتابوں کے نزول کا سلسلہ ختم، اس لیے اس نبی ﷺ کے بعد نبوّت کا سلسلہ بھی ختم۔ اس کے بعد سوچیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم کو خاتم النبیّین ﷺ کہا (33:40) تو اس کے صحیح قرآنی مفہوم کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہو سکتی ہے! قرآنِ کریم کے خاتم الکتب (آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کتاب) تسلیم کر لینے کے بعد نبی اکرم ﷺ کے خاتم الانبیاء (سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی) ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآن کریم کے متعلق کہا ہے، اس کے بعد اگر حضور ﷺ کے متعلق، خاتم النبیّین ہونے کا اعلان نہ بھی کیا جاتا تو بھی حضور ﷺ کے آخری نبی ہونے میں دو آراء نہ ہو سکتیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں سوچیے کہ قرآن کریم کو خدا کی کتاب ماننے والوں کے ہاں ختمِ نبوّت بھی کوئی ایسا مسئلہ ہو سکتا تھا جس میں کسی بحث کی گنجائش ہوتی! لیکن وائے بدنصیبی کہ ہمارے ہاں ایسی مسلّمہ حقیقت پر بھی گزشتہ ساٹھ ستر برس سے بحث ہو رہی ہے اور مسلسل بحث! آپ کو معلوم ہے کہ اس بحث کا مدار کس چیز پر ہے؟ (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) روایات پر۔''(2)

علامہ پرویزؒ ختمِ نبوّت کے مفہوم کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ''قرآن ہمیشہ کے لیے خدائے زندہ کی کتابِ زندہ ہے اور اسی کی وساطت سے نبوّت محمدیہ تمام نوعِ انسان کے لیے آخر تک، زندہ و پایندہ ہے۔ اور یہ ہے ختم، نبوّت کا صحیح مفہوم جس نے نوعِ انسان کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کر دیا۔ یہ انسانیت پر خدا کا احسان عظیم ہے۔''(3)

علامہ پرویزؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''شہکارِ رسالت، عمرِ فاروقؓ'' میں بھی عقیدہ ختم نبوّت کے حوالے سے جامع گفتگو کی ہے۔ علامہ پرویز کتاب مذکورہ کے مقدمہ باعنوان ''گزرگاہِ خیال'' میں رقم طراز ہیں ''قرآن کریم سے میں نے اس حقیقت کو بھی سمجھ لیا کہ خدا سے ہمکلامی صرف حضراتِ انبیاء کرامؑ کو حاصل ہوتی تھی (جسے وحی کہا جاتا ہے) اس کا سلسلہ

(1) معراجِ انسانیت از پرویزؒ، ص:455 (2) ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیت از پرویزؒ، ص:24-25 (3) معراجِ انسانیت از پرویزؒ، ص:456

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات پرختم ہوگیا۔حضور ﷺ کے بعد خدا سے ہم کلامی کا تصوّرختمِ نبوّت کی مہرتوڑنے کا نہایت غیر محسوس اور (بظاہر) معصوم سا طریقہ ہے، اور عجمی سازش کا نتیجہ۔خدا نے اپنی جو باتیں (کلام) انسانوں تک پہنچانی تھیں، وہ قرآنِ کریم میں محفوظ کردیں۔ان میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافہ کی حاجت۔لہٰذا مزید ہمکلامی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔یہی ختمِ نبوّت کا مفہوم ہے۔''(1)

علامہؒ رقم طراز ہیں ''ختمِ نبوّت کی مہرتوڑنے اور وحی کے مقابلے میں اُس کا ہم پایئہ ایک نیا دروازہ کھولنے کے لیے محدّث کا نظریہ وجود میں لایا گیا۔لیکن یہ خصوصیت اہلِ تشیع کے ائمہ کرام تک محدود رہی، اس لیے اُس کا اثر نفوذ بھی انہی کے دائرے میں مقیّد۔سُنیوں کے ہاں اس کے مقابل، دو قسم کی وحی کا نظریہ اختراع کیا گیا اور قرآن سے خارج عقائد و احکام کو قرآن کا ہم پایہ قرار دے دیا گیا۔لیکن یہ چیز نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس تک محدود رہی اور اس کا ماحصل احادیث کے سر مایہ میں مقید،ضرورت اس امر کی محسوس کی گئی کہ خدا کے ہاں سے ''براہِ راست علم پا لینے'' کے اس امکان کو قیامت تک ممتد کر دیا جائے۔اس ضرورت کو تصوّف نے آکر پورا کر دیا، وہ تصوّف جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ: اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔(اقبال نامہ، جلد اول، ص:78)''(2)

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''اہلِ تشیع کے ہاں محدّث کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سر چشمۂ علمِ خداوندی سے رسول اللہ کو وحی ملتی تھی، اسی سے ائمہ کرام کو علم حاصل ہوتا تھا۔بعینہٖ یہی عقیدہ اہلِ تصوّف کا ہے۔سرخیلِ صوفیاء محی الدین ابنِ عربیؒ جنہیں شیخِ اکبر کہا جاتا ہے، اپنی مشہور کتاب، فصوص الحکم، میں لکھتے ہیں: جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل، صاحبِ زمان، غوث، قطب لیتے ہیں۔روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔لہٰذا اولیاء ان کے متعلق رسول خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں۔اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔لہٰذا، خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔پس ایک طور پر، مادّۂ کشف والہام اور مادّۂ وحی و رسول ایک ہے۔صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقہ سے واقف ہونے کی وجہ سے، خاتم النبیّن کے موافق ہے۔ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کا انتقال ہوگیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امامت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہیں۔پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں۔وہ معدنِ خاتم النبیّن و مادۂ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لیے تھے۔خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔اگر خلیفۂ ولی ظاہر میں متبعِ نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔''(3)

(1) شاہکارِ رسالت از پرویزؒ، ص:11 (2) ایضاً، ص:469، بحوالہ اقبال نامہ، جلد اوّل، ص:78 (3) ایضاً، ص:470

کتابِ مذکورہ (شاہکارِ رسالت، عمرِ فاروقؓ) میں علامہ پرویز علیہ الرحمۃ نے ''مرزا غلام احمد قادیانی'' پر سخت تنقید کی ہے۔ علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''جب تصوّف کے اس عقیدہ نے (جس کی بنیاد محدّثیت کے نظریہ پر تھی اور جس کی ابتداء شیعوں کے ہاں سے ہوئی تھی) کشف و الہام کے دروازے کھول دیئے تو اس سے دعویٰ نبوّت کا بھی اِمکان پیدا ہو گیا۔ چناں چہ مرزا غلام احمد قادیانی انہی سیڑھیوں سے مقامِ نبوّت تک پہنچنے کے دعویدار ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ،'' ہمارے سیّد الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعدِ آنحضرت کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس لیے شریعت میں نبی کے قائم مقام محدّث رکھے گئے ہیں۔'' دوسری جگہ لکھتے ہیں،''میں نے لوگوں سے سوائے اس کے جو میں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، اور کچھ نہیں کہا کہ میں محدّث ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اُسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح محدّث سے۔'' سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی روشنی میں اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دِقّت نہیں رہتی کہ مرزا صاحب نے محدّثیت کا تصور کہاں سے مُستعار لیا؟۔''(1)

علامہ پرویزؒ نے، مرزا صاحب، کی مزید تحریرات کے حوالے دیئے اور ان کے دعوٰؤں کا رد کیا، جو کہ کتابِ مذکورہ کے آخری ڈھائی صفحات پر مشتمل ہیں۔

علامہ پرویزؒ، کی ایک اور تحریر سے اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے محدّث کے مفہوم کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ علامہ پرویزؒ شیعوں کا عقیدہ محدّث پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد رقم طراز ہیں ''ختمِ نبوّت کا عقیدہ اسلام کا اصل الاصول ہے۔ اس کا مطب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے جو کچھ دینا تھا وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف نازل کردہ وحی میں تکمیل تک پہنچ گیا اور قرآن مجید کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح حضور ﷺ کے بعد، خدا کی طرف سے راہنمائی ملنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا آپ آخری نبی اور رسول ہیں۔ مرزا غلام احمد (قادیانی) نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس پر سخت اعتراضات ہوئے تو اس نے کہا،'' آپ لوگ کیوں، قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (ﷺ) اس امّت کے لیے بشارت دے چکے ہیں کہ اس امّت میں بھی پہلی اُمتوں کی طرح محدّث پیدا ہوں گے اور محدّث، بفتح دال وہ لوگ ہیں جن سے معاملات و مخاطبات الٰہیہ ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرأت میں آیا ہے۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ (آخر تک) پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے لکھا ہے، محدث کا الہام یقینی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا'' آپ دیکھئے کہ مرزا قادیانی نے وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ۔ کو ''آیت'' کہا ہے یعنی مروجہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ (22:52) وہ بھی قرآن کی آیت ہے اور ''ولا محدث'' کے اضافہ کے ساتھ بھی قرآن کی آیت ہے۔ (معاذ اللہ) اس (ولا

(1) شاہکارِ رسالت از پرویزؒ، ص:475، 476

محدث، کے اضافہ والی) آیت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں، ''ہمارے سیّد الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعدِ آنحضرت کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس لیے شریعت میں نبی کے قائم مقام محدّث رکھے گئے ہیں۔'' نبی کے قائم مقام محدّث؟ آپ نے دیکھا کہ اختلافِ قرأت کا باطل عقیدہ، بات کہاں کہاں پہنچا دیتا ہے لیکن بایں ہمہ اسے صحیح مانا جاتا ہے۔[1]

آئیں ہم آپ کو پرویز صاحب کا ایک اور اہم کام بتاتے ہیں کہ ''1926ء کا ذکر ہے ریاست بھاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا، جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعوٰی کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کرلیا ہے، جس کی وجہ سے وہ مرتد ہوگیا ہے، اس لیے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی۔۔ ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟۔''[2]

''مرزائیت (قادیانیت) اور طلوعِ اسلام'' میں درج ہے کہ اسلامک فاؤنڈیشن، لاہور نے اسے ''مقدمہ مرزائیہ بہاولپور'' کے عنوان سے من وعن تین جلدوں میں شائع کیا ہے اور اس کی ضخامت 1852 صفحات پر مشتمل ہے، اس فیصلے میں صفحہ 17 پر لکھا ہے کہ مدعہ کی طرف سے چھ گواہان مولوی غلام محمد صاحب شیخ الحدیث عباسیہ بہاولپور، مولوی محمد حسین صاحب سکنہ گوجرانوالہ، مولوی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی مرتضٰی حسن صاحب چاند پوری، سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری، مولوی نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، پیش ہوئے، اس سے اس مسئلہ کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے، فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ نبوّت کی حقیقت کیا ہے؟ نبی کسے کہتے ہیں؟ (فیصلہ مذکورہ ص:53)۔ آگے چل کر فاضل جج نے لکھا ہے کہ مدعیہ اور مختلف علمائے کرام کی پیش کردہ نبی کی تعریفیں میرا اطمینان نہ کرسکیں۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان ''میکانکی اسلام'' از چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، میری نظر سے گزرا۔ اس سلسلہ میں نبوّت کی جو حقیقت انہوں (پرویز صاحب) نے بیان کی ہے اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ مدعیہ کی طرف سے ثابت ہوگیا کہ مرزا صاحب کاذب مدعیٔ نبوّت ہیں۔ مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہوچکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخِ ارتداد سے مدعا علیہ سے فسخ ہوچکا ہے۔''[3] مذکورہ کے اقتباس سے عیاں ہوا کہ مشہورِ زمانہ مقدمہ کا فیصلہ پرویز صاحب کی ایک تحریر کی بدولت عمل میں لایا گیا۔

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''جولائی 1973ء کی بات ہے (ہفتہ وار) چٹان (لاہور) کے نمائندہ نے میرا ایک انٹرویو لیا، جو اُس اخبار میں بھی چھپا اور بعدازاں، طلوعِ اسلام، بابت، اگست 1973ء میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں، میں نے اپنے کوائفِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ: میری پیدائش مشرقی پنجاب کے قصبہ بٹالہ (گورداس

---

(1) کتابچہ قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش، از پرویزؒ، (ص:19-20) (2) کتابچہ مرزائیت (قادیانیت)، ص:5

(3) ایضاً، ص:6 تا 13، بحوالہ مقدمہ مرزائیہ بہاولپور، ص:101-102، اسلامک فاؤنڈیشن، 1 ڈیوس روڈ، لاہور،

پور) میں ہوئی، بٹالہ ایک مذہبی شہر تھا اس لیے (اس دور کی عام فضا کے مطابق) وہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ، آریوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے اکثر مناظرے رہا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا موقع مل گیا۔ بعد میں مختلف فرقوں کے باہمی مباحثوں یا آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کا دور تو ختم ہو گیا لیکن ختمِ نبوت کے موضوع پر مسلسل لکھتا چلا آرہا ہوں، کیوں کہ میرے نزدیک انکارِ ختمِ نبوّت کا فتنہ امّت کے لیے خطرناک ہے۔ چوں کہ میں اس مسئلہ پر قرآنِ خالص کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں، روایات میں نہیں الجھتا، اس لیے فریقِ مقابل کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔"(1)

اب یہ کہ علامہ پرویزؒ کا یہ کہنا کہ "ختمِ نبوت کے موضوع پر مسلسل لکھتا چلا آرہا ہوں، کیوں کہ میرے نزدیک انکارِ ختمِ نبوّت کا فتنہ امّت کے لیے خطرناک ہے۔" درست ہے۔ پرویزؒ صاحب کی اکثر تحریرات اور اُن کے مضامین، آخری کتاب، اور ختمِ نبوّت و رسالت ہی ہیں، مذکورہ عنوانات کے تحت اردو زبان میں جتنا پرویزؒ صاحب نے لکھا ہے شاید کسی اور شخص نے لکھا ہوگا؟ ہم نے صرف ان کی چند ہی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جب کہ لغات القرآن، مطالب الفرقان، مفہوم القرآن اور ان جیسی کچھ اور بھی کتابیں ہیں جن میں، پرویزؒ صاحب نے عقیدہ ختمِ نبوّت کا دفاع کیا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف کی آیت 158 (قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ١٥٨) کے تحت لکھتے ہیں "ہمارے ہاں، مسئلۂ ختم نبوت پر بھی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہتی ہیں (للہ الحمد کہ مرزا غلام احمد کے متبعین کو قانوناً دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کے بعد بحثوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔ میں سمجھتا ہوں کہ (دیگر آیات کے علاوہ) صرف یہ ایک آیت اس موضوع پر قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ جس رسول ﷺ کی رسالت "جمیع نوعِ انسان" کے لیے ہو، اس کے بعد انسانوں کی طرف کسی اور رسول کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"(2)

اب آپ خود فیصلہ کیجیے کیا پرویزؒ (معاذ اللہ) قادیانی تھے؟ یا، عقیدہ ختمِ نبوّت کے حقیقی مجاہد۔ کیا منکرِ حدیث تھے؟ یا محافظ ناموسِ رسالت۔ آپ نے علامہ پرویزؒ کی عقیدہ ختمِ نبوّت کے تحفظ کے لیے پیش کی گئی خدمات کو ملاحظہ فرمایا۔ بعض حضرات جو علامہ پرویزؒ کے بارے میں منفی باتیں کرتے ہیں یا بے جا الزامات لگاتے ہیں ہمارے نزدیک اُن کے الزامات کا حقیقت سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ علامہ پرویزؒ کی تحقیقات و نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد رسول ﷺ، اللہ رب العٰلمین کے آخری نبی و رسول ہیں اور قرآن مجید اللہ رب العٰلمین کی آخری کتاب ہے، محمد رسول ﷺ کے بعد براہِ راست علم، اللہ رب العٰلمین سے نہیں مل سکتا، سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا ہے، اب صرف قرآن مجید ہی آخری وحی ہے، جو قیامت تک کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ کشف و الہام کا نظریہ اور کسی کی آمد کا انتظار عقیدہ ختمِ نبوّت کے منافی ہے۔ مجدّد، محدَّث، غوث، قطب، ابدال کے نظریات کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ سب عجمی لوگوں کی کارستانی اور عقیدہ ختمِ نبوّت کے خلاف نظریات ہیں۔

---

(1) ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیت، ص:3 (2) مطالب الفرقان از پرویز، جلد پنجم، ص:413

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی نظام اتنے مختصر عرصہ میں کیوں ختم ہو گیا

ہمارے ایک قریبی عزیز جن سے ہمیں محبت بھی ہے اوران کا احترام بھی ہے۔ پختہ سیرت، بہت تعلیم یافتہ اور پیشہ کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر۔ انہوں نے ہم سے اسلامی نظام کے متعلق چند سوالات / اعتراضات کیئے اور جواب طلب کرنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ اس قسم کے سوالات عام طور پر کثرت سے کیئے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے جوابات کو مضمون کی صورت میں تحریر کر کے رسالہ طلوعِ اسلام میں طبع کرا دیا جائے تاکہ اور حضرات بھی ان کو مطالعہ فرمالیں۔

(1) عزیز القدر ڈاکٹر صاحب کے سوال / اعتراض یہ ہیں کہ جو نظام حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور اس سے اپنے دور میں اچھے نتائج برآمد ہوئے تھے وہ اتنی مختصر مدت میں ختم کیوں ہو گیا۔

(2) کیا اس موجودہ دور میں اس نظام میں جاری ہونے کی صلاحیت ہے۔

(3) اگر اس نظام میں اس موجودہ دور میں جاری ہونے کی صلاحیت ہے تو اس کو کس طریقہ سے جاری کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تک انسانیت نظام کے تصور سے واقف نہیں تھی۔ انسانوں نے خود کوئی نظام وضع نہیں کیا یہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ از خود بنتا چلا گیا۔ بالکل شروع میں قبائلی سسٹم تھا۔ مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ وہ قبائلی سسٹم ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔ قرآنِ کریم پہلی کتاب ہے جس نے شخصیات کا دور ختم کر کے ایک نظام کا تصور پیش کیا۔ اس نظام کا جاری ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت انسانیت بالغ ہو چکی تھی کہ اس نے اس نظام کو جاری کر دیا۔ حضور ﷺ کے دورِ سعید میں یہ نظام دس ہزار میل تک پھیل چکا تھا اور خلافتِ راشدہ میں یہ نظام 22 ہزار میل پر وسیع ہو گیا تھا۔ اس نظام کے قیام میں کوئی مافوق البشر عنصر شامل نہیں تھا۔ ہم جیسے انسانوں نے اس کو قائم کیا اور ہم جیسے انسان ہی اس کو دوبارہ قائم کریں گے۔ اس نظام کو قائم کرنا اور اس کا انقراض لوگوں کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔

اس نظام کے جلد ہی انقراض کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ تصورات جن پر یہ نظام قائم ہوا تھا وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔ اس وقت کی عقل انسانی ان کی پوری طرح گرفت نہیں کر سکی۔ اس موجودہ دور کی عقل بھی ان کی

تحسین نہیں کرسکی۔ کیونکہ اس موجودہ دور تک تمام مملکتیں مقصود بالذات ہوتی ہیں، ان کے سامنے کوئی مقصود یا مطمح نگاہ نہیں ہوتا۔ صرف اسلامی مملکت وہ مملکت ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ مقصود بالغیر ہوتی ہے اور یہی بات اس کی وجہ امتیاز ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت اور اس کی تفصیل ہم آگے پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے دورِ میں مکہ کی آبادی 20 ہزار اور مدینہ کی آبادی 25 ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ حضور ﷺ کا ذاتی رابطہ زیادہ تر مدینہ کے لوگوں سے تھا اور صرف وہی حضرات اسلامی نظام سے فکری طور پر متاثر ہوئے۔ مدینہ کے باہر کی آبادی جو ناخواندہ تھی۔ اس میں سے ایک فیصدی آبادی بھی اسلامی نظام سے فکری طور پر متاثر نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جو بہت نقصان دہ بات اس نظام کے سلسلہ میں ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے بہت سرعت کے ساتھ فتوحات حاصل کیں تقریباً ساڑھے چھ سو مربع زمین روزانہ فتح ہو رہی تھی۔ اس کے برخلاف یہ صورت تھی کہ ان تصورات کی تبلیغ وتشریح بالکل نہیں ہوئی جن پر نظام قائم تھا۔ تمام مفتوحہ علاقہ کے لوگ بحیثیت قوم اپنے سابقہ غیر قرآنی نظریات پر قائم تھے۔

ایک بات جو بہت قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ایران کی فتح مسلمانوں کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ ایرانی عربوں سے دلی نفرت کرتے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ہم فردوسی کا شاہنامہ پیش کرتے ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کا ایک ایک شعر عربوں کے خلاف آگ اُگلتا ہے۔ اور تنفر کے پھنکارے مارتا ہے۔ ایرانیوں کی نفرت کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں نے عرب سے نکل کر جو ممالک مغرب میں فتح کئے۔ ان نے اپنی اپنی زبان ترک کر کے عربی زبان کو اختیار کرلیا جس سے ان کی قرآن سے محبت اور عربی کلچر سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ عراق، مصر، سوڈان، لیبیا، مراکش تک، براعظم افریقہ کے شمالی ممالک جو عربوں نے فتح کئے، سب نے اپنی اپنی زبان ترک کر کے عربی زبان کو اپنی زبان بنالیا، لیکن عرب جب مشرق کی طرف بڑھے اور انہوں نے ایران کو فتح کیا، تو ایرانیوں نے اپنی زبان ترک نہیں کی اور انہوں نے عربی زبان اختیار نہیں کی۔ اُس وقت کے ایرانی دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اُس وقت کے ایرانیوں نے ہی سازش کر کے حضرت عمرؓ کو شہید کیا جس کی وجہ سے اسلامی نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ شہادت کے وقت حضرت عمرؓ تقریباً 62 سال کے تھے، اگر وہ ایرانی سازش کے تحت شہید نہ کئے جاتے تو وہ مزید 20 سال اور کام کرتے۔ یہ دنیا اسباب وذرائع کی دنیا ہے۔ اگر حضرت عمر 20 سال اور کام کرتے تو یہ نظام مزید مستحکم ہوتا۔ ہم یہ بات اس وقت کے ایرانیوں کے متعلق تحریر کر رہے ہیں۔ اس موجودہ دور کے ایرانیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سازش کے ساتھ ہی ایرانیوں نے امیر المومنینؓ، امام المتقین حضرت علی المرتضیٰؓ کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اور وہ ان سے بہت قریب ہوگئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنجناب ان پر کلی بھروسہ کرنے لگے۔ مکہ جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے اور حضور ﷺ کو اپنا وطن ہونے کی وجہ سے اس سے دلی محبت تھی لیکن اس کے فتح ہونے کے بعد بھی حضور ﷺ نے اپنا دارالخلافہ مدینہ کو بنایا لیکن امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنا دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔ کیونکہ کوفہ سے ایران Govern ہوتا تھا۔ ایرانیوں کے جو عقائد اپنے بادشاہوں کے متعلق تھے کہ ان بادشاہوں کو

Divine Right کا استحقاق تھا۔اسی طرح کے تقدس کا ہالہ انہوں نے حضرت امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ کے گرد بھی کھینچ دیا۔ایرانیوں کی دخل اندازی میں اس لئے بھی اضافہ ہوا کہ ایرانیوں ہی کی مدد سے بنوعباس کو اقتدار حاصل ہوا تھا۔ بنوعباس کی حکومت 6 سوسال تک رہی ہے۔اس 6 سوسال تک حکومت ایرانیوں نے ہی چلائی۔زیادہ تر خلفاء کی مائیں ایرانی تھیں جو بچپن میں ہی خلیفہ کے نظریات مجوسی مذہب کے مطابق ڈھال دیتی تھیں۔اس دور میں اقامتِ صلوٰۃ کا ترجمہ ''نماز پڑھنا'' ہوا۔عبادت کا لفظ قرآن نے محکومیت کے لئے استعمال کیا ہے۔لیکن جب ایرانیوں نے دین کو مذہب میں تبدیل کردیا تو عبادت کے معنی پرستش کے ہوگئے۔اسی دور میں دین کے تمام افکار ونظریات مذہب کے افکار میں تبدیل کردیئے گے تو دین کس طرح قائم ہوسکتا تھا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت شیخ الہند نے عبادت کا ترجمہ پوجنا کیا ہے(43:81،43:45،39:17،39:14،39:66)۔

آپ Google پر جاکر Majoose Worship پر Click کردیں ہماری بات کی تصدیق ہوجائے گی۔بنو عباس کے 6 سوسالہ دور میں ہمارا سارا لٹریچر تحریر کیا گیا ہے۔تفاسیر،احادیث،فقہ،اسماء الرجال کی سب کتابیں اسی دور میں تحریر ہوئیں۔جن آیات میں دین کا تصور تھا ان کا ترجمہ عمداً ایسا کیا گیا جن میں غلبہ کا تصور نہ رہے۔

قرآنِ کریم کا ارشادِ عالی ہے کہ زندگی (The Life) اس کائنات کے وجود میں آنے سے پیشتر سے موجود ہے۔جب تک زندگی نے کوئی پیکر نہیں پہنا انسان اس حالت میں نہیں تھا کہ اس کا ذکر ہوسکے لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا (76:1)۔ آواز ایتھر Ether میں ہمارے اردگرد ہوتی ہے،لیکن اس کا کوئی نام نہیں۔جب یہ آواز ریڈیو یا T.V میں آتی ہے تو اس کا نام آواز ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ T.V کی آواز بلند کردو۔زندگی جرثومہ کی شکل میں آنے کے بعد یعنی جب زندگی نے جرثومہ کا پیکر لیا تو پھر یہ زندگی کہلائی۔پھر اس کے بعد اس نے مختلف پیکر اختیار کئے۔سعدی نہیں کہا تھا۔

خاک و بادو آب و آتش بندہ اند　　　　با من و تو مردہ باحق زندہ اند

آپ آم کی ایک گٹھلی زمین میں بودیں کچھ عرصہ بعد یہ گٹھلی آم کا تناور درخت بن جائے گی۔مٹی کی زندگی اس گٹھلی کو آم بناتی ہے۔نباتات میں زندگی موجود ہے کیونکہ یہ پودے نشوونما پاتے ہیں۔جانوروں کی زندگی ہم خود دیکھتے ہیں۔زندگی جب حیوانیت سے بلند ہوتی تو زندگی کو مجموعی طور پر ایک صلاحیت عنایت ہوئی۔زندگی کو یہ صلاحیت دیکر،اس کو انسانیت میں منتقل کردیا گیا اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ کی صلاحیت Potential بھی آگیا۔قرآنِ کریم نے اس صلاحیت کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی تو اس کو روح کہا گیا اور جب اس صلاحیت کو انسان کی طرف نسبت دی تو اس کو نفس انسانی کہا گیا۔صلاحیت یہ ایک ہی ہے۔قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا قائل ہے۔لیکن وہ روحِ انسانی کا قائل نہیں ہے قرآن میں کسی جگہ روحِ انسانی کا ذکر نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش کی Stages قرآن نے کئی مقام پر بیان فرمائی ہیں(23:12،23:1،6:2) لیکن کسی ایک مقام پر بھی ادخالِ روح کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔روح انسانی کا عقیدہ وضعی

روایات کے ذریعے عیسائیت سے آیا ہے۔

نفس انسانی کو نشو و نما دینا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے نفس انسانی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ دوسرا طریقہ اس کی نشو و نما کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی مستقل اقدارِ حیات پر عمل کیا جائے۔ چند مستقل اقدار کا تعارف ہم آگے چل کر کریں گے۔ ان تمام اقدار کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے سے ساری انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ مستقل اقدار ابدی اور دائمی ہیں۔ یہ کسی دور میں یہ نہیں کہیں گی کہ ہم تھک گئے ہیں۔ یا بوڑھی ہوگئی ہیں۔ ہم اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکیں۔ یہ ہر زمانہ کا ساتھ دیں گی، اور ہر زمانہ میں اپنے نتائج برآمد کریں گی۔ اس انسانی ذات پر ایمان لانا ہی مسلمان ہونا ہے۔ اس ذات پر اسلامی نظام کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو اقامت دین کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس ذات پر ہی ایمان نہیں لاتے، تو اسلامی نظام کے قائم کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے سابق میں تحریر کیا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ذات کی نشو و نما کرنا ہے اس لئے اسلامی مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد بالغیر ہوتا ہے کہ اس ریاست میں ہر انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک زندگی کی موجودہ سطح آخری منزل نہیں ہے بلکہ زندگی رواں دواں ہے اور یہ مزید ارتقائی منازل Stages حاصل کرتی چلی جائے گی۔ اس زندگی کی نشو و نما مستقل اقدارِ حیات پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مستقل اقدارِ حیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عقلِ انسانی وہ مستقل اقدارِ حیات وضع نہیں کر سکتی۔ یہ مستقل اقدارِ حیات ہمیشہ رہیں گی اور ہمیشہ ہمیشہ ذات کو نشو و نما دیں گی۔ یہ اقدار پوری انسانیت کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ یہ خیال کہ اسلامی نظام گذشتہ ادوار کے لئے تھا اور اب اس موجودہ دور میں وہ قائم نہیں ہو سکتا اس لئے غلط ہے کہ اسلامی نظام کی اساس مستقل اقدار پر ہوتی ہے اور آپ خود ملاحظہ فرمالیں کہ یہ مستقل اقدار ہر زمانہ میں نافذ ہو سکتی ہیں اور ہر زمانہ میں ایک سا نتیجہ برآمد کرتی ہیں۔ صرف تعارف کی غرض سے ہم چند اقدار کا ذکر کرتے ہیں۔

(1) مستقل اقدار میں ایک نمایاں قدر احترامِ انسانیت ہے۔ چونکہ ہر بچہ انسانی ذات اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر انسان واجب التکریم ہوتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا ہے۔ قرآن کی رُو سے احترامِ انسانیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس احترام میں خواتین بھی برابر کی شریک ہیں۔ قرآنِ کریم پوری انسانیت کو خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے: خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) ہم نے تم سب کو ایک نفسِ واحدہ یعنی ایک Life Cell سے پیدا کیا ہے۔

2۔ عدل کرنا: تمام انسانوں کو اپنی صلاحیتیں نشو و نما کرنے کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا۔ محنت کا بروقت معاوضہ دینا۔ ہر کسی کے حقوق و واجبات ادا کرنا قانون کے مطابق فیصلے کرنا جو سب پر برابری کی صورت میں نافذ کرنا، عدل کہلاتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم عالی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:90) اللہ عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی مستقل قدر ہے جو کبھی بھی نہیں چھوڑی جاسکتی۔ قرآنِ کریم میں آیا کہ اپنی دشمن قوم سے بھی عدل کرو (5:8)۔ اس قدر کے ذیل میں ہم ضمنی طور پر تین امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ قدر قیامت تک فائدہ دے گی۔ یہ قدر کبھی انسانیت کو نہیں چھوڑ سکتی۔ دوسری بات یہ قابلِ توجہ ہے کہ یہ قدر باقی اقدار کی طرح پوری انسانیت کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ نبیؑ پر عدل کے قوانین بھی عطا فرمائے جن کے مطابق فیصلے کرنے سے عدل حاصل ہو۔ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان کے قانون کے مطابق فیصلے کرنے سے عدل حاصل ہوجائے گا۔ ہندوستان میں ذات پات کا جواز قانوناً موجود ہے۔ وہاں دلیت کا احترام نہیں ہے۔ اسی طرح برطانیہ کے قوانین میں سود، ہم جنس پرستی جیسے قبیح فعل قانوناً جائز ہیں جب اللہ تعالیٰ نے عدل کا حکم دیا ہے تو عقلاً یہ بات ازخود واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اپنا قانون لازماً دے گا جو نافذ ہوگا اور ایسی ریاست جس میں اللہ کے قانون جاری ہوں وہ ہی اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔

تمام مستقل اقدار کی وضاحت کرنے سے مضمون بہت طویل ہوجائے گا اس لئے ہم ان مستقل اقدار میں سے چند اقدار کا صرف حوالہ پیش کرتے ہیں۔

(3) تعین مدارج بہ اعتبار عمل وصلاحیت (49:13)۔

(4) کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (15:85، 21:16، 44:38) بالحق کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ یہ تعمیری نتائج کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ سراب یا مایا نہیں ہے۔ یہ کائنات جس مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ مقصد ہم مضمون کے آخر میں عرض کریں گے۔

(5) علم وعقل (2:33)، آزادی (18:26، 18:110)۔

(6) وحدت انسانیت (62:2، 13:17) وحدت امت (30:31) مستقل اقدار میں توازن (7:180)۔

عزیز محترم/معترض ان اقدار کو پیش نظر رکھیں اور غور فرمائیں کہ ان میں سے کون سی اقدار ایسی ہیں جس پر اس زمانہ میں عمل نہ کیا جاسکے یا وہ انسانیت کا ساتھ نہ دے سکے۔

باقی رہا یہ سوال کہ یہ کس طرح قائم ہوگا۔ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ جب انسانیت خود اپنے وضع کردہ نظاموں سے سخت تنگ آجائے گی۔ تو اسلامی نظام ہی انسانیت کی آخری پناہ گاہ اور انسانیت کا آخری سہارا ہوگا۔

اسلامی نظام کے منقرض ہونے اور دوبارہ قائم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے عبادت کا قرآنی مفہوم ترک کرکے عجمی ملوکیتی مفہوم اختیار کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے عبادت کا معنی محکومی بیان کئے ہیں لیکن مسلمانوں نے اس کے معنی پرستش کردیئے اور یہی تبدیلی ان کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ کیونکہ پرستش ہر جگہ ہوسکتی ہے اس کے لئے اسلامی نظام کی

ضرورت نہیں اطاعت اور محکومیت صرف اسلامی نظام میں ہوتی ہے۔

عبادت کے معنی اطاعت کے بجائے پرستش کے اس لئے ہوئے کہ دین مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مذہب میں پرستش ہوتی ہے اور دین میں اطاعت ہوتی ہے۔ طَاعَةٌ مَّعۡرُوۡفَةٌ ؕ (24:53) طاعت معروف ہوتی ہے۔ پرستش کا بدلہ مرنے کے بعد ملتا ہے۔ اطاعت کا بدلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے پرستش کے لئے اسلامی نظام کی ضرورت نہیں۔ آپ ہر ملک اور ہر نظام میں خدا کی پرستش کر سکتے ہیں۔ قرآن میں دور دور تک پرستش کا تصور نہیں آتا۔

(1) عبادت کا مادہ (ع ب د) ہے۔ عبد بمعنی غلام ہوتا ہے ارشادِ عالی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ؕ (2:178) اے ایمان والو فرض ہوا تم پر قصاص، برابری کرنا مقتولین میں۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت۔ حضرت شیخ الہند نے عبد کا ترجمہ غلام بھی کیا ہے اور قرآن نے بھی اس کو الحر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عبد اپنے مالک کی پرستش نہیں کرتا بلکہ وہ صرف اس کی اطاعت وغلامی کرتا ہے۔ اس مادہ کے اعتبار سے عبادت کے معنی محکومی ہی ہو سکتے ہیں۔

(2) زیر غور آیت کے نزول سے پیشتر مسلمان اور کافر عورت یا اس کے برعکس دونوں صورتوں میں نکاح کی اجازت تھی۔ اس آیت کے ذریعہ اس کو حرام قرار دیا گیا اور ارشادِ عالی ہوا وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَکُمۡ ؕ (2:221) ترجمہ: اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ تمہیں بھلا لگے۔ یہاں پھر حضرت شیخ الہند نے عبد کا ترجمہ غلام کیا ہے اور قرآن نے بھی اس کو غلام کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جو مالک کی اطاعت کرتا ہے۔ پرستش نہیں کرتا۔

(3) سورۂ مریم میں ارشاد ہے اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾ (19:93) ترجمہ: کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہو کر یعنی سب مخلوق اس کے بندے ہیں اور بندے ہی بن کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ پھر بندہ بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور جس کے سب محکوم ومحتاج ہوں اسے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت۔ اس آیت کے حاشیہ پر مولانا عثمانی نے عبد کا ترجمہ محکوم کیا ہے۔

(4) سورۂ النور میں ارشادِ عالی ہے: وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَآئِکُمۡ ؕ (24:32) اور نکاح کر دو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں۔ یہاں پھر حضرت شیخ الہند نے ''عِبَادِکُمۡ'' کا ترجمہ تمہارے غلام کیا ہے جو اپنے آقا اور مالک کی محکومی کرتے ہیں۔ پرستش کبھی نہیں کرتے اور اس آیۂ کریمہ کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے یعنی لونڈی اور غلام کو اگر اس لائق سمجھو کہ حقوق زوجیت ادا کر سکیں گے اور نکاح ہو جانے پر مغرور ہو کر تمہاری خدمت نہ چھوڑ بیٹھیں گے تو ان کے نکاح کر دو۔ اس حاشیہ میں حضرت نے خود واضح کر دیا کہ ''اگر وہ تمہاری خدمت نہ چھوڑ بیٹھیں۔'' کہ عبد خدمت کرتا ہے۔ پرستش نہیں کرتا۔ اگر کوئی عبد (غلام) پرستش کرتا تو حضرت اقدس پرستش کا لفظ استعمال فرماتے۔

(5) حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ نے جب فرعون اور اس کے سرداروں کو دعوتِ اسلام دی تو اس کے جواب میں فرعون اور اس کے درباریوں نے کہا: فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ترجمہ: بولے کیا ہم مانیں گے اپنے برابر کے دو آدمیوں کو اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے۔ حضرت شیخ الہند نے یہاں عابد کا ترجمہ تابعدار کیا ہے کیونکہ بنو اسرائیل فرعون اور اس کی قوم کی تابعداری کرتی تھی۔ ان کی پرستش نہیں کرتی تھی۔ اس آیت کے حاشیہ پر مولانا عثمانی نے تحریر فرمایا ''یعنی موسیٰ وہارون کی قوم یعنی بنو اسرائیل تو ہماری غلامی کر رہی ہے ان میں کے دو آدمیوں کو اپنا سردار کیسے بنائیں۔''

(6) جب حضرت موسیٰ ؑ نے فرعون کو اسلام پیش کیا تو اس نے حضرت موسیٰ ؑ کے سامنے اپنے احسانات بیان کرنے شروع کر دیئے جو اس نے حضرت موسیٰ ؑ پر کئے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ ؑ نے نیم طنز اور نیم مزاحاً فرمایا وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:22) اور کہا یہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنایا۔ حضرت شیخ الہند نے عبدت کا ترجمہ ''غلام بنایا ہے'' کیا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی عبادت کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آج کل حکومت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(7) سورہ کہف میں ایک جگہ آیا ہے: وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) ترجمہ: ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ: وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح سورہ یوسف میں پہلے کہا کہ: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40)، حکومت اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی اور اس کے بعد فرمایا: اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ ان تمام مقامات پر قرآن کریم حکومت اور عبادت کو مرادف المعانی کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

ہم نے یہاں صرف چند آیات کریمات پیش خدمتِ عالی کی ہیں تا کہ یہ ثابت کر دیں کہ عبادت کے معنی پرستش نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنی اطاعت کرنا اور محکومی اختیار کرنا ہوتے ہیں۔ اس ایک لفظ کے غلط معنی کرنے سے قرآنِ کریم کی ساری تعلیم ہی اصل تعلیم کے برعکس ہوگئی ارشادِ عالیٰ ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے تمام مترجمین اور سارے علماء کرام اس کا یہی ترجمہ کرتے ہیں کہ ہم نے جن وانس کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہماری پرستش کریں۔ فی الحال آپ الجن کے مفہوم کو ملتوی کریں کہ وہ دوسرا مسئلہ ہے ایک نیا مضمون شروع ہو جائے گا اور ہم اپنے نقطۂ ماسکہ سے ہٹ ہو جائیں گے۔ اس وقت صرف انس کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کہ انسانوں کو اللہ نے اس لئے تخلیق کیا ہے کہ وہ ہر وقت پرستش کرتے رہیں۔ مقصد تخلیق ہی اللہ کی پرستش کرنا رہ گیا۔ اب یہ بات غور کرنے کی ہے کہ کوئی انسان ہر وقت پرستش نہیں کرسکتا۔ اس لئے اگر وہ کوئی کام بھی پرستش کے علاوہ کرے گا تو وہ مقصدِ تخلیق کے خلاف چلا جائے گا۔ جو بڑے بڑے بزرگ اور عبادت گذار لوگ ہیں وہ بھی چوبیس گھنٹے پرستش نہیں کرسکتے۔ اس لئے باقی وقت جو وہ

گزارتے ہیں وہ مقصدِ تخلیق کے خلاف چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہی یہ بھی ارشادِ عالی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسطیٰ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کی نگرانی کرو اور تمہارا رسول (اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہاری نگرانی کرے اگر مسلمان ہروقت نماز، تہجد، نوافل ادا کرتے رہیں تو یہ اتنا بڑا کام جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سپرد کیا کہ وہ ساری دنیا کی نگرانی کریں تو یہ مقصد تخلیق کے خلاف ہوجائے گا۔ دوسرے مقام پر ارشادِ عالی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) مفہوم: تم بہترین اُمت ہو اور تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم پوری انسانیت کو فوائد پہنچاؤ، معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔ معروف ومنکر قرآن کریم کی اپنی اصطلاحیں ہیں۔ اسلامی نظام کے احکامات معروف ہوتے ہیں اور جن چیزوں سے اسلامی نظام روکتا ہے وہ منکرات ہوتے ہیں۔ پوری انسانیت کو نفع پہنچانا خود ایک بہت بڑا کام ہے لیکن عام ترجمہ کے مطابق یہ بھی مقصد تخلیق کے خلاف جاتا ہے۔ ان آیات کے علاوہ ایک مقام پر ارشاد ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13) ساری کائنات تمہارے لئے مسخر کردی گئی ہے۔ ان تمام قوتوں کو اپنے قابو میں لاؤ۔ اللہ تعالیٰ تو مسلمانوں کو یہ احکامات دے رہا ہے، لیکن یہ ہیں کہ ایک گوشہ میں بیٹھے نمازیں پڑھ رہے ہیں اور دو وظائف ہورہے ہیں۔ چالیس چالیس دن کے چلے ہورہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے۔ صرف اس لئے کہ قرآنِ کریم میں عبادت کے معنی پرستش کرکے، تخلیق انسانیت کا مقصد پورا کیا جارہا ہے۔

عزیزِ محترم کا سوال یہ بھی تھا کہ اسلامی نظام قائم کس طرح ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ آبادی کے ایک حصہ کو اس کے قیام کے لئے تیار کیا جائے۔ اگر ایک طبقہ اس کو قائم کرنے کے لئے تیار ہوجائے تو ان کو فکری طور پر Convince کرنا ہوگا کہ اس کو قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ ہی نظام اپنی طرف کھینچتا ہے جس کے ثمرات ونتائج اس دنیا میں سامنے آئیں۔۔ سب سے پہلے اُنہیں اس بات پر ایمان لانا ہوگا کہ زندگی کی موجودہ سطح زندگی کی آخری Stage نہیں ہے۔ یہ مزید بلند ہوتی چلی جائے گی اور مزید ارتقائی مراحل طے کرتی جائے گی۔ یہی ایمان بالآخرت ہے۔ جب ایک طبقہ اس بات پر ایمان لے آئے، تو اسی موجودہ حکومت میں مستقل اقدارِ حیات کو نافذ کرنا شروع کردیں۔ مستقل اقدار کے نافذ کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شہری اپنی ذات کی نشوونما کرنے کے لئے کسی مستقل قدر پر عمل کرتا ہے تو اس کا اثر نظام پر از خود پڑتا جاتا ہے۔ جب کسی ملک کے باشندے عدل کرنے کی مستقل قدر پر عمل کریں گے، تاکہ ان کی ذات کی نشوونما ہو، تو اس معاشرہ میں عدل عام ہوجائے گا اور سارا معاشرہ عدل سے مملو ہوجائے گا۔ نفس کی نشوونما کے لئے ایک قدر یہ ہے کہ: الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کی ذات نشوونما پاتی ہے۔ اسلامی نظام میں دوسروں کی پرورش سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے، تو اس معاشرہ میں ہر شخص کو رزق ملتا جائے گا۔ ہر مستقل قدر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس پر اپنی ذات کی نشوونما کے لئے عمل کیا جاتا ہے، لیکن

معاشرہ بھی از خود اس سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حکومت کے قوانین کے خلاف کوئی کام کرنا جرم کہلاتا ہے۔ جب معاشرہ میں سب لوگ مستقل اقدار پر عمل کریں گے تو اس معاشرہ میں جرم کا ارتکاب نہیں ہوگا۔ نفس پر بُرے اثرات پڑنے سے ہر شخص اجتناب کرے گا، تو اس حکومت میں کوئی جرم سرزد نہیں ہوگا۔ کیونکہ جرم کا اثر نفس پر فوراً مرتب ہوجاتا ہے، اور اس سے نفس مضمحل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ معاشرہ جرائم سے پاک ہوگا۔

اسلامی نظام اس لئے بھی قائم کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے جو وعدے کئے ہیں وہ انسانوں کے ہی ہاتھوں اس نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ ارشادِ عالی ہے: وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6) کوئی متنفس زمین پر ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ آسمان سے خود روٹیاں نہیں پھینکتا بلکہ اسلامی نظام یہ وعدے پورا کرتا ہے۔ دوسرا وعدہ یہ ہے کہ جب انسان نے اس دنیا میں زندگی بسر کرنی شروع کی اور زندگی انسانیت کی حدود میں داخل ہوگئی تو ارشاد عالی ہوا: فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝۳۸ (2:38) انسانوں کو ہماری طرف سے ہدایت (قوانین) مسلسل ملتی رہے گی۔ پس جو قوم ان قوانین کے مطابق نظام قائم کرے گی تو اس نظام میں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اس وقت پورا ہوسکتا ہے جب آپ اس کے قوانین کے مطابق نظام قائم کریں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ اس میں خوف وحزن نہیں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ حسنہ ہیں ان کا بھی یہ تقاضہ ہے کہ ان صفات عالیہ پر عمل کیا جائے۔ اس لئے اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کردیا جاتا ہے تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی موقع نہ ملتا۔ مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم جیسی صفات، حالانکہ عالم کے پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ اسلامی نظام کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ مستقل اقدارِ حیات، صفاتِ خداوندی کا ہی عکس ہوتی ہیں۔ اسلامی مملکت میں صفاتِ خداوندی پر عمل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا قائم کرنا فرض ہوتا ہے۔ اس نظام میں تمام افراد معاشرہ اپنے میں زیادہ سے زیادہ صفاتِ خداوندی کو اجاگر کرتے ہیں اور مملکت بھی اسی پر عمل کرتی ہے۔ اس طرح مملکت اور افراد معاشرہ کی زندگی کا مقصود و مطلوب ایک ہی ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے، وہ سب کی ربوبیت کرتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے میں صفت ربوبیت کو زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے ہر شخص کو یہ صفت اپنے میں بشری حد تک پیدا کرنی چاہئے۔ جس قدر کوئی انسان صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرے گا اسی قدر اس کو تقرب خداوندی حاصل ہوتا چلا جائے گا۔ اور اسی نسبت سے وہ اسلامی نظام کا بہترین شہری ہوتا چلا جائے گا۔ صفاتِ خداوندی پیدا کرنے کے لئے علامہ اقبال نے فرمایا:

رنگ اُو برکن مثالِ او شوی   در جہاں عکسِ مثال او شوی

چونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر انسانی ذات کی نشوونما جسم کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ اس

لئے انسانی جسم کی پرورش بھی ضروری ہوتی ہے لہٰذا اسلامی نظام میں معاشی نظام ایسا جاری ہوتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری انفرادی کے بجائے اجتماعی کردی گئی ہے۔ اور یہ ایک معاشی انقلاب بہت بڑا انقلاب ہے۔ یہ صرف قرآن ہی کرسکتا تھا۔ ایک مزدور اگر بچوں کو کھانا فراہم نہیں کرسکا تو اس کے بچوں کی بھوک کا ذمہ دار وہ مزدور نہیں ہے بلکہ بچوں کی بھوک کا ذمہ دار وہ نظام ہے۔ یہ نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ جسم کی پرورش اس طرح سے ہوتی ہے کہ رزق کمانے کی جدوجہد اور کوشش انسانی ذات کی نشوونما میں خارج نہ ہو بلکہ یہ اس کے نشوونما کے لئے مددگار بن جائے۔ یہ نظام اپنے باشندوں کو حصولِ رزق کی فکر سے آزاد کردیتا ہے تاکہ وہ اپنے مقاصد زندگی کے لئے زیادہ وقت دے سکیں۔ ان مقاصد کو بھی حاصل کرنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے، اس سے بھی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد سے قرآنِ کریم کے وحی پر مبنی تصورات کائناتی رفتار سے چلے آرہے ہیں، اور ان نظریات نے انسانیت کو دنیا کے ہر گوشہ میں متاثر کیا۔ جو نظریات اپنے دور میں قرآن نے دیئے تھے۔ عقل انسانی بھی by Trial and error ان ہی نظریات پر پہنچتی ہے۔ مضمون طویل ہوگیا ہے ہم ان چند نظریات کو پیش کرتے ہیں جو قرآن نے دیئے ہیں اور جن کو انسانیت نے ازخود قبول کیا۔ یہ قرآن کے وحی ہونے کی دلیل ہے۔ قرآن نے:

(1) انسان کو احترام دیا (17:70) اس لئے انسان کی حکومت انسان پر حرام قرار دی (3:79)

(2) شخصیات کا دور ختم کیا۔ اور سب سے پہلے انسانیت کو نظام کے تصور سے آگاہ کیا۔

(3) ذات پات کی تمیز ختم کی (49:13)

(4) وحدت انسانیت کا تصور دیا (2:213)

(5) سرمایہ داری اور جاگیرداری کو ختم کیا۔

(6) (فرانس کے انقلاب کے تینوں نظریات)۔ آزادی، اخوت، مساوات۔

(7) ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ہے۔

(8) مشاورت وشوریٰ کا حکم دیا (3:159، 42:38)

(9) انسانوں کی تقسیم وطن، رنگ، نسل کی بجائے آئیڈیالوجی، پر رکھی۔

(10) اس زمانہ میں انسانوں سے کہنا کہ یہ فرضی وموہوم قوانین وجود نہیں رکھتے کائنات کی ساری قوتیں انسان کے لئے مسخر کردی گئیں (45:13)

(11) غلامی کا خاتمہ فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47:4)

(12) ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت کا تصور ختم کیا۔

یہ چند تصورات قرآن نے اُس وقت دیے جو سب آج کے بھی تقاضے ہے۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مرد مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

SPREAD OF CORONAVIRUS (COVID-19) AND THE QURAN

Dr. Ejaz Rasool, Glasgow, UK

Regarding the spread of the COVID-19 across the world which has now been declared as a pandemic by the WHO, according to my understanding, an analysis should be based on the following assumptions:

1. Is COVID-19 a naturally originating and occurring virus e.g. from animals (bats) to human beings?
2. Or is it part of some kind of biological warfare triggered by some powerful nation and which may have unexpectedly gone wrong?
3. Or is it even part of a greater plan e.g. the New World Order (NWO), of which the general public is unaware till all the facts become known a few years hence – just like the 9/11 event which led to various invasions and occupations of other lands?
4. Or could it be something else completely, which is not yet known?

I will discuss this briefly from the Quranic perspective, and during this process will attempt to throw some light on the state of the world in which we currently reside, and will then bring both strands together at the end. There are many verses in the Quran which deal with the rise and fall of nations in the context of the functioning of the Law of Requital (see the book titled '*What is Islam?*' by G.A. Parwez for more details). I will quote some references from the Quran which are pertinent to the discussion in hand:

'Mischief has appeared on land and sea because of the deeds that the hands of men have done – so that Allah (as a consequence) may give taste of some of their deeds in order that they may come back.' (30:41)

In another verse it is stated:

'Allah sets forth a parable – a society enjoying security and peace, abundantly supplied with sustenance from all directions: yet was it rejecting the blessings of Allah (by not sharing these with others) – so as a consequence Allah made it to taste of hunger and fear like a garment because of the evil which they manufactured (deliberately). And there came to them a messenger from among themselves, but they falsely rejected him – so the wrath seized them in the middle of their injustices.' (16:112-113)

And at another place, the Quran states:

'Before you We sent messengers to people, and we afflicted them with suffering and adversity so that they may learn. When the suffering reached them from Us, why then did they not learn? On the contrary their hearts became hardened and Satan made their deeds seem alluring to them. But when they forgot the warning they had received We opened to them the gates of all things until in the midst of

their enjoyment of Our gifts, on a sudden We called them to account, when as a consequence they were plunged into despair. Of the unjust the last remnant was cut off. Hamd to Rabb of all the worlds.' (6:42-44)

I have quoted these three verses in order to discuss three different scenarios to which the Quran has drawn our attention, and which in my view are relevant to the spread of COVID-19 across the world.

Current State of the World

Using Quranic criteria, we can assess this relatively easily. For example, some of the following are a representation of the state of the world which we see around us today:

1. Injustice prevails in all walks of human life in every country – there is one law for the rich and another for the commoner. Most laws are legislated by the elite in power and are biased towards benefitting the richest at the top (the top 1%).
2. The capitalist system has a firm hold on the economy of the world, and rich countries (and people) are becoming wealthier at an increasingly rapid rate. The concept of the trickle-down approach is evidently not successful.
3. Exploitation of the poor across the world is rampant.
4. The free movement of people is now extremely restricted on the planet – only the rich and powerful can move around freely. The citizens of the West are among the richest and most powerful i.e. belonging to Pharaoh's household.
5. Wars and conflicts are being triggered and managed by Pharaohs (who are appointed and supported by the biggest Pharaoh) at all levels, openly and blatantly – the quasi influence which the UNO had seems to have been even further minimized.
6. Children are being exploited at all levels – hidden paedophilia cases from the past are constantly becoming exposed. This points to the depth of the moral depravity in the world.
7. Objectification of women is being exposed by women themselves.
8. The hidden agenda for control of the world under the garb of the NOW executed through false flag events, the banking system, political rhetoric, the deep state, media control, etc can be witnessed relatively clearly.
9. The agenda for the promotion of LGBTQi is being pursued formally in every country – so-called Muslim nations remain quiet on the subject and are not raising any concerns, possibly from fear of reprisals.
10. A population explosion is taking place in the underdeveloped world, which is becoming poorer and poorer.
11. The media projects targeted propaganda with specific information based on lies in order to manipulate the opinions of the general non-thinking masses – this helps those who get elected to continue plying the agenda of the rich (1 %).

12. Wherever religion is prevalent and influential, people are 'non-thinking' and have closed their minds to the realities of life. All underdeveloped and poor countries are under the spell of the false belief system of religiosity which is a further tool which aids the rich in controlling the ever increasing and multiplying flood of humanity which remains mostly in ignorance of these matters.
13. No-where in the world is any voice being raised on the dire need for the Quran in the lives of human beings, and the issue of the human self and its requirements for development. Like a lonely voice in the desert, Tolu-e-Islam is the only organisation in current times in the world standing for pure Quranic guidance.
14. In the name of diplomacy and national interest, might is declared to be right, and divide and rule is the policy; relatively powerful nations are exploiting those that are less powerful. This is cascading from the top to the bottom and is visible throughout the world. It is accepted as the norm and despite the fact that some leaders do attempt to raise their voice, they end up however doing exactly the same to others when it comes down to their own nation interests.
15. No-one accepts the existence of the Law of Requital, indeed most of the world functions as if there is no life beyond this physical existence. Most people in the world strive and strain for the immediate benefits of life, with no consideration for the longterm consequences of their actions – for them, the question of the hereafter does not even arise in their consciousness.
16. Economically and militarily, the US and its allies have a firm grip over the planet in every arena, even including space. Most leaders are planted in powerful positions in different countries through the connivance of the US, and those few who raise any objections find themselves quickly silenced and neutralised. Many others who may think about it, do not have the courage or the resources to become activists and whistleblowers which then prolongs the status quo.

These are some of the issues facing the ordinary man in this world, and the Quran has clearly pointed to this state throughout its verses which highlight this evil. We can also observe by their actions and words, that even among those who claim to be purely Quranic, there are some who do not appear to be fully convinced of its message, and are not willing to become a wholehearted companion of Allah, in the way that the Quran invites us to become.

If the Quran is what it claims to be i.e. from Allah, then it must signpost for us the state of the world in which we live, and bearing this in mind and using our intellect and reasoning, we should be able to obtain some signs from the information which is available to us about the events taking place around us. Secondly, when we wish to scrutinise events in the world from the Quranic perspective, we need to bear in mind that this world has been created for man with a specific purpose i.e. to help man to create and develop his own self after acquiring *Eimaan* and then doing righteous

deeds, in order to acquire a self which can help to establish Deen (the Quranic System of *Rabubiyat*). If the environment in the world reaches such a stage that Deen then becomes a very remote possibility indeed, either because most of the people are not interested in it, or life has become untenable for those people who have managed to tread on the Quranic path life, then an 'intervention' becomes essential as per the Law of Requital. The world which we see around us appears to have nearly reached that stage where both these conditions co-exist.

COVID-19 Issue

Following this introduction, I will now briefly discuss the events triggered by COVID-19 which are taking place across the world.

a. The Quran has stated very clearly that Allah does not do injustice to mankind – it is human beings themselves who do injustice to their own selfs (10:44). This means that we need to study and analyse events around the world in the light of this Permanent Value. For this reason, I have stated at the beginning that regarding this disease, we have to look for the human hand behind this whole episode, whether accidental e.g. spread from bats in China or whether deliberate, as part of biological warfare. For biological warfare, we have to assess the state of the world prior to the onset of this disease e.g. the US vs China trade war.

b. Though still relatively weak compared to the USA and the West, China has emerged as a power in the last two to three decades. It is not that the US is not aware of this rise, in fact in many ways the US has helped China to become a service nation in order to deliver a higher profit to the US and other Western corporations. As with India, China also supports a very large population, a large majority of whom are very poor. As a result of this availability of very cheap labour, both of these countries are able to manufacture and produce industrial goods at a fraction of the cost at which the US and West could. The Quran has referred to this state of affairs in verse (83:1-6), and has declared that the existence of these kinds of conditions in the world will lead to mankind rising up for its rights (83:6). If this is true, then this should manifest in the world at some stage – the question is how?

c. The so-called global crisis in 2008-9 was caused by the financial institutions in the West and was managed through quantitative easing and other manipulations. However, the fundamental problem of the capitalist system was not addressed, and cannot be addressed, as the solution lies only in developing and establishing a system which is in accordance with Quranic values. Any system which is devised by human beings alone will be based on the assumption that life ends with death – there is no question of human self development even appearing in this concept. The Quranic system is based on the fact - not the assumption - that the life of the human self does not end with death, and in fact continues on beyond the point of physical death. If the

second concept is based on fact, then where is the evidence for the establishment of such a system in the world, when there are only a few who even think about this as a possibility?

d. Is it possible that this COVID-19 event is some carefully contrived man-made attempt to achieve some ends which we are not yet aware of when we only glance at it superficially, and that it requires further serious investigation? For example, through the creation of a worldwide fear and panic and some kind of economic downturn, the objective is to thereby control the world's population, and to persuade them to comply with certain instructions e.g. participation in some compulsory vaccination programme? This may seem far fetched to many but there is no harm in exploring the possibilities which can then be discounted further down the line if the evidence does not support the hypotheses.

e. If the new system of Deen has to emerge from the ashes of the previous man-made system, or has to come into existence through a transitional intermediate stage, then there should be some signs for this in the world in which we live – what are those signs? The Quran has clearly stated to us that this is your world, and it is you who make the decisions in this life (41:40), and this is very much supported by the available evidence in the world. The US and its allies directly and indirectly control the world, and there appears to us to be no visible evidence of any intervention by Allah. This means that we need to examine the Quranic teachings very carefully and find out how do we obtain guidance from it to aid us in this analysis of the existing state of the world. Unless we do this, we are not going to understand the state of the world, and if we do not understand this aspect, then we cannot obtain the help from Allah which is promised in the Quran (24:55). It also means that as part of developing our self to that level where we can help to establish Deen, this understanding will help to signpost our path in life, and motivate us to persistently follow the path of the Quranic guidance.

f. This also means that we fully comprehend that built within the human system is its own downfall after a certain period of seemingly apparent success, and that those who have acquired extreme power in the world, and think that it will continue as such, are going to be proven wrong. If we use the Quranic criteria correctly, it can help us to assess this fairly accurately, so that we can be prepared for it and help to give rise to the establishment of the foundation for the system of Deen. It is obvious that the outline of the work of this system of Deen should be in place in terms of concepts, trained Momineen, plans, identification of resources, threats and opportunities analyses, and other fundamentals which are required for a new system. Tolu-e-Islam provides a platform for this kind of work which needs to be developed extensively to accommodate all these pre-requisites.

.Now let us look at the three scenarios described in the three sets of verses noted at the start:

Scenario 1

Let us firstly take the verse (30:41). This describes the state of the world in which there is a lot of chaos and injustice stemming from human hands – it appears that this is not yet engulfing the whole world as the verse mentions the consequences of some of the deeds of men, pointing to the fact that the powerful have created disorder, but hopefully they will learn their lesson and mend their ways. This means that the situation has not yet reached a stage of no return, and the verse concludes by saying that possibly these people will recognise their unjust behaviour and reform. If we relate this to the world of today, then it can also mean that someone will draw their attention towards the Law of Requital as given in the Quran, and this may help them to go in the right direction. Obviously, this has not happened in the world of today, as the so-called Muslims have done nothing in this direction. Pakistan, which was created with the sole purpose of establishing the system of Deen as a model, has not only failed dismally (in fact it never actually started in the first place), but has gone from bad to worse. And furthermore, as yet there are absolutely no signs that this is happening anywhere in the world.

This of course leads us to the question of whether establishment of the system of Deen is possible? The answer to this lies within the process of the development of the self – just as the potential of a seed lies within the seed itself and not outside of it. Those individuals who are moved by the multitude of human problems across the world, and are also searching for guidance through which to solve these problems, can benefit from the Quranic revelation in which the procedure is clearly laid out for those who wish to follow this path. If we follow this procedure, then it may seem to be impossible initially, but gradually, bit by bit, the evidence starts appearing that the establishment of such a system lies within the realm of possibility, otherwise this whole universe and creation becomes meaningless. Allah has proclaimed clearly and emphatically that the universe is not created without a purpose, and the creation of man is part of the grand scheme of creation, in which a human being is created with free will and intent in order to become an active member of this creative process. Human accountability is a part of this process of the establishment of a system of Deen. Through the simple procedure of acquiring Eimaan, and then willingly performing righteous deeds, this leads to the development of an enhanced level of consciousness which holds Allah with His attributes as a model, and then such a self with this level of consciousness becomes eligible for the full support of Allah – this is called the companionship of Allah (2:257).

In summary, we need to acquire that level of development of the self which becomes deserving of the support of Allah in the establishment of Deen in this life – linked implicitly with this is Jannat (Paradise) of the next life. The self

which can understand the significance and nature of Jannat of the next life through Quranic guidance, can understand the need and significance of the system of Deen in this world.

Scenario 2

Verses (16:112-113) go a stage further in that they point clearly to the state of nations (or civilisations) prior to their fall. These nations acquire power, and consequently become firmly established, and as they acquire further power, they also increase in their abuse of other human beings. Slowly but surely, along with all of those who aid and abet them, these people then reach that stage where they bring such calamities upon themselves resulting from their own acts, and which then lead to a great deal of suffering for both the rich and poor all together. WW1 and WW2 fall into this category. The current pandemic of COVID-19 may fall into this category – more on this later. The Quran concludes by stating that these people will fall into despair and all will be affected. We have been informed that COVID-19 is not a fatal condition for most of the population, but due to media coverage and hype, fear is ramped up to that degree which is not proportional to the risk which it poses to human health. The question here is, why? Is it deliberate, or is it the consequence of the way in which the world is presently organised?

Scenario 3

Verses (6:42-44) take us a step further than the above two scenarios, because here the state of nations or people follows the same pattern as under Scenario 2, but it concludes by declaring that the roots of this nation or people were then cut off i.e. they ceased to exist as an important entity in the world.

It is also possible that this is all a pre-conceived and carefully contrived and manufactured plan which has been put into operation to test the waters i.e. to obtain certain results e.g. to create fear in the population in order to assess the degree to which potential control mechanisms for the masses can be engineered for the future, or to implement a forced vaccination programme for some other hidden motives. In this case, the first three scenarios will be delayed, and we will need to wait for the effects of this event once it is over, and study the economic and political impact resulting from the whole affair.

Discussion/Conclusions

Now returning to the COVID-19 situation, it appears to me that it is not triggered naturally i.e. from bats to humans. There appears to be enough evidence (though not confirmed) that there is a human hand behind the spread of this virus – however, the question is who did it? There can be many scenarios in terms of using carriers to start an epidemic, but it appears to start from China, then to Iran and to Italy. All three have political and economic issues with the US. This is a novel virus, which appears to have been created with a specific target in mind if we examine its characteristics closely. My conclusion at this stage of my understanding, based on the available information, is as follows:

(1) This is more likely to be a man-made virus specifically launched to achieve some specific purpose(s)? However, we cannot come to any conclusion until all the dust settles down or more information transpires.
(2) In terms of its projected effects, it is possible that it may have got out of hand from what was originally planned i.e. to let it remain confined within a certain region of China?
(3) Initially it was claimed that it will subside with an increase in temperatures as the weather improves, but now nothing is being mentioned about this temperature effect, and we are told the problem will continue on well into the next few months, or even beyond. Why is this?
(4) If it is something which has got out of control because of some miscalculation, then the economic outcomes of this error are going to be colossal, and this will assist us when assessing the scenarios mentioned above in light of current events.

In terms of its effects on the general population, in the West it has had a significant demoralizing effect and created massive fear and anxiety. The effects on economies are already being felt and these may not be mitigated through the usual measures of interest rates reduction, quantitative easing, tax reductions, etc. Previously, powerful nations could instigate wars to divert the attention of the public, and through emergency measures could overcome economic issues temporarily, but that option appears to have waned as the general public appears to have little appetite for further wars. One thing is certain, and that is that Western nations will be weakened and will take time to recover – the time for resurgence could be short. This may provide some respite to less powerful nations so that their leadership can take advantage of this and make attempts to bolster their economies and strengthen their education base. With the condition of the present attitudes in the world, there appears to be little hope of drawing the attention of people to the pure Quranic teaching as an alternative to the capitalist system – but you never know? The Quran has stated that the system of Deen will ultimately replace man-made systems (9:33, 61:9) as a model, and this will be the start of an era in which no human being will be the slave of another human being, whether physically or psychologically. For us, the point to ponder is, why has this system not yet emerged? The reason is clear i.e. the world is an arena of human thoughts and deeds, and the individuals required to establish this system are not going to appear from the heavens –people like you and me are the ones who have to develop their selfs to that level where the establishment of Deen can begin in society. Until these individuals emerge of their own volition and effort, the world will continue in the existing slow pace towards the establishment of Allah's rule which will in any case come eventually, and the majority of mankind will continue to suffer as noted earlier. With the intervention of Momineen however and the establishment of Deen, that rule of Allah based on the Quran can appear at a faster pace and so benefit mankind far more quickly.

My conclusion is that, whatever may be the outcome, the world will change once this event is over, and from the Quranic perspective, we need to do the following:

(a) Increase our efforts to disseminate the Quranic message to as many people as possible.

(b) We need to generate more resources for this work.

(c) We need to educate and train those who have already come to the Quranic guidance i.e. have acquired Eimaan and are doing righteous deeds willingly. They need to be helped to reach that stage of developing their self where they can be employed under the system of Deen.

(d) When people are weak and in a state of despair, they may be more inclined to hear about message of the Quran – the Quran also states that man calls out to Allah when in despair, and then forgets once he is free from his difficulties (10:12). The post COVID-19 world may be ready to listen to the Quran and we need to work towards this.

(e) Even if the aim of the Pharaoh of the world system is to achieve a nefarious objective by creating fear and economic deprivation, we should not become despondent and overwhelmed by this, as we have the Quran to guide us. The Quran has asked us to follow its guidance and create our self by developing it to the highest level possible which meets its criteria, and things will start to fall into place for the emergence of a system of Deen. It is just like a seed which has all the potential of growing into a fruit tree and which, if the soil conditions are right, will germinate into a sapling initially, and gradually over time, through nourishment, will grow into a mighty tree.

(f) Recognising that Allah's Deen on earth will emerge more rapidly through the efforts of human hands (as per the Quran, it will arrive in any case in its own time but that is a much slower pace), we need to stay motivated and resolute, as His Law of Requital is continuously functioning. During this pandemic of COVID-19, we need to remain alert to the opportunities to always take the Quranic message forward.

توجہ فرمائیں

پرویز صاحب کے ویڈیو درسِ القرآن و دیگر لیکچرز درجِ ذیل یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

www.youtube.com/idaratolueislam/

-4 وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔

-5 وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

-6 کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

-7 وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

-8 مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

-9 ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

-1 کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

-2 جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

-3 جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

-4 جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

-5 جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

-6 جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو' جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
04

Monthly **TOLU-E-ISLAM**
25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

خوشخبری

محترم قارئین سلام ورحمت الحمدللہ!

ہم نے پرویز صاحب کی کتب ''مفہوم القرآن، لغات القرآن، تبویب القرآن'' کو انٹرلنک کرکے ایک مشترکہ اینڈرائیڈ موبائل ایپ کے بعد اب آئی او ایس ایپ بھی تیار کرلی ہے جوکہ آئی فون (IPhone) استعمال کرنے والوں کے لئے "Quran With Lughat" کے نام سے حاضرِ خدمت ہے۔ اُمید ہے اس سے ہر خاص وعام مستفید ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس چھوٹی سی کوشش کو قرآنِ کریم سمجھنے کا ذریعہ بنائے۔

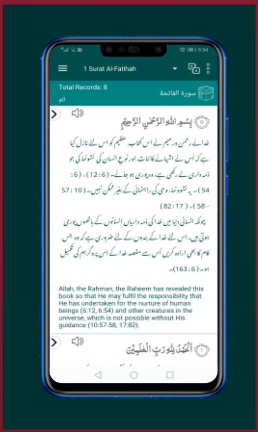

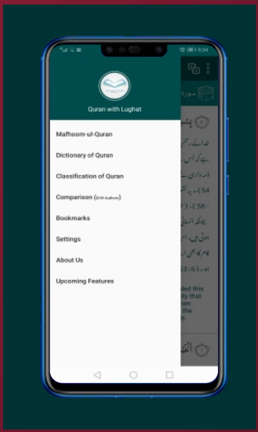

اب آئی فون یوزر ایپ سٹور سے اور اینڈرائیڈ موبائل یوزر گوگل پلے سٹور سے اس ایپ کا نام لکھ کر بآسانی ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں۔ ان کے لنک درج ذیل ہیں:

For Android Mobile:
https://play.google.com/store/apps/details?id=oreference.com.mafhoom_ul_quran&hl=en

For IPhone:
https://apps.apple.com/us/app/quran-with-lughat/id1496779212

محمد اقبال
(نمائندہ بزم طلوعِ اسلام، کراچی، ڈی ایچ اے)